پانچواں باب

واپسی

وہ ڈری سہمی اپنی تین سالہ بیٹی کو اپنے ساتھ چمٹائے، دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ خوفزدہ نظریں سامنے کھڑے اُس قبیح شخص پر جمی تھیں۔

''میں تمہاری ہر بات مانوں گی، اللہ کے واسطے میری بیٹی کو چھوڑ دو۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔ پلیز تقی!۔۔۔پلیز'' تقی سامنے کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ اور فاطمہ اپنی بیٹی کے ساتھ اُسکے قدموں میں ڈھیر، روتی ہوئی، اُس سے منت سماجت کر رہی تھی۔ اُسے روتا دیکھ کر اُسکی بیٹی بھی ساتھ ساتھ رو رہی تھی۔ کچھ دیر قبل ہی اُسے تقی نے بیلٹ سے پیٹا تھا۔

''میری بچی معصوم ہے، اُسکے ساتھ ایسے مت کرو۔۔۔'' اُس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''مجھے معلوم تھا تم ایسا ہی کرو گی۔ اسی لیے اسکا حل میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا'' وہ سکون سے کہتا اُٹھ کھڑا ہوا تو، فاطمہ سہم کر پیچھے ہٹی۔

''ویسے بھی تمہاری بیٹی میں مجھے رتی برابر دلچسپی نہیں ہے'' وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے پاس رکھی دیوارِ گیر الماری کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اور وہ اُسے دم سادھے دیکھ رہی تھی۔

''تمہاری بیٹی کی ویسے بھی کوئی خاص قیمت نہیں مل رہی تھی مجھے، البتہ صرف تمہارے اوپر ترس کھا کر میں اپنے عربی کلائنٹ (گاہک) کو تمہاری بیٹی دے رہا تھا۔'' وہ الماری سے کوئی کاغذات نکال کر اُسکی طرف بڑھنے لگا۔ اُسکا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُسکی کوئی بات فاطمہ کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔

''لیکن تم اس لائق نہیں ہو کہ تم پر ترس کھایا جائے'' اُسکے کے قریب پہنچ کر اُسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اُسکی گردن میں درد کی ٹیس اٹھی تھی، بیٹی روتے ہوئے اُس سے چپک گئی۔

''میرے عربی کلائنٹ نے تو مجھ سے تمہارا مطالبہ کیا تھا، لیکن صرف تم پر ترس کھا کر میں نے بدلے میں تمہاری بیٹی کی ڈیل کی تھی۔ لیکن۔۔۔'' فاطمہ کی سانسیں رکیں۔

''جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ تم ترس کھانے کے لائق نہیں ہو۔اسی لیے اب تم ہی اُس کے پاس جاؤ گی،ویسے بھی تمہاری وہ کروڑوں میں قیمت ادا کر رہا ہے'' زہر خند لہجے میں کہتے اُس نے اُس کا سر دیوار پر دے مارا تھا۔چوٹ سے زیادہ تکلیف اُسکے الفاظ سے ہوئی تھی۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟اپنی ہی بیوی کا سودا کرو گے؟کتنے غلیظ انسان ہو تم'' وہ چیخی تھی۔

''چچ چچ چچ۔۔۔تم سے کس نے کہا کہ تم میری بیوی ہو؟''اُسکے ہنسنے پر وہ لمحوں میں ساکت ہوئی۔۔۔

وہ کیا کہہ رہا تھا؟

''یہ دیکھو۔۔۔''اُس نے وہ لفافہ جو کچھ دیر قبل وہ الماری سے نکال کر لایا تھا،اُس کے حوالے کیا۔اُس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ وہ لفافہ کھولا۔جبکہ وہ مکروہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔اُس نے کاغذات باہر نکالے۔

''طلاق نامہ۔۔۔''کاغذ ہاتھوں میں کانپ گیا۔وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''تت۔۔۔تم مجھے طلاق دے رہے ہو؟''

''اوں ہوں۔۔۔''اُس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''دے نہیں رہا، تین ماہ پہلے دے چکا ہوں۔ذرا غور سے تاریخ پڑھو''اُسکے سکون سے کہنے پر فاطمہ نے کاغذات کو پورا باہر نکالا۔وہ اُسے قانوناً طلاق دے چکا تھا۔لیکن کب؟پچھلے چار ماہ سے تو وہ دبئی میں تھا۔آج ہی وہ واپس آیا تھا اور آتے ہی اُس نے فاطمہ کے سر پر یہ دھماکہ کیا تھا۔اُس پر تشدد تو وہ پہلے ہی کرتا تھا۔البتہ آج وہ اپنی بیٹی کے لیے اُسکے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوئی تھی، جسکی سزا اب بھگتنا تھی۔

''اب تم میری بیوی نہیں ہو، چلو جلدی! تیاری پکڑ لو۔۔۔کل تمہاری شادی اُس عربی سے ہے۔اور تم اُسکے ساتھ ہی یہاں سے رخصت ہو گی'' وہ اُسکے ہاتھوں سے کاغذات واپس جھپٹتے ہوئے بولا۔

''نہیں نہیں۔۔۔نہیں پلیز۔۔۔ایسا مت کرو۔تم مجھے مارو پیٹو۔لیکن ایسا نہیں کرو۔خدا کے لیے مت کرو'' وہ روتے روتے اُسکے پیروں میں پڑ گئی تھی۔تقی نے کھڑے ہوتے ہوئے ایک ٹھوکر اُسے دے ماری۔وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔وہ جانے کے لیے مڑا، پھر دروازے پر رکا اور اُسکی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے جانے کے بعد تمہاری بیٹی کی ذمے داری میری نہیں ہو گی، لہٰذا اُسے میں مار دوں گا'' سرد لہجے میں کہتے وہ دروازہ بند کرتے باہر نکل چکا تھا۔

فاطمہ کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ جو گناہ وہ کر بیٹھی تھی، اُسکا خمیازہ وہ پچھلے تین سال سے بھگت رہی تھی۔ لیکن اُسکی بیٹی؟ اُسکی اُس معصوم بیٹی کا بھلا کیا قصور تھا؟ اُسکے کیے کی سزا اُسکی بیٹی کو نہیں ملنی چاہیے تھی۔

اُسکے سامنے سارے دروازے بند تھے، لیکن ایک دروازہ کھلا تھا۔۔

صرف ایک دروازہ۔۔۔

وہ جو کبھی بند نہیں ہوتا۔۔۔۔

فاطمہ آفندی اٹھی اور اپنے لہولہان وجود کو گھسیٹی باتھ رُوم کے جانب بڑھی تھی۔ وضو کر کے وہ واپس آئی تو کمرے میں کوئی ایسی شے نہ ملی جسے مصلے کے طور پر بچھایا جا سکتا۔ وہ زمین پر ہی سجدہ ریزہ ہو گئی۔

''یا اللہ !۔۔۔ یا اللہ۔۔۔'' کتنی ہی دیر تک تو وہ بس اللہ کے نام کا ورد کرتی رہی، اُسے پکارتی رہی لیکن اُس سے آگے کچھ بول ہی نہ پائی۔

''یا اللہ، میرے باپ نے۔۔۔ جس ہستی کے نام پر میرا نام رکھا تھا۔ میں اُنکے نام کی کبھی لاج نہ رکھ سکی۔ اُنہوں نے تو کہا تھا کہ میرا جنازہ رات کے وقت نکالنا، تاکہ کسی نا محرم کی نظر نہ پڑے۔ اور میں۔۔۔ میں تو اللہ۔۔۔ دن کی روشنی میں اپنے سارے پیاروں کی عزت کو پامال کرتی، سارے اصول توڑتی۔۔۔ حرام حلال کا فرق کیے بنا گھر سے نکل گئی تھیں۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا'' وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر رہی تھی۔

''یا اللہ ! وہ جنّتی عورتوں کی سردار ہیں، حضرت فاطمۃالزہرہؓ، اگر روزِ محشر اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ۔۔۔ میرے نام کی اتنی وقعت بھی نہ تھی تمہارے نزدیک؟ تو میں کیا کروں گی؟'' وہ روتی جا رہی تھی۔

''اللہ! میرے کیے کی سزا میری بیٹی کو نہ دیں۔۔۔ میری بیٹی کو یہاں سے نکال دیں میرے اللہ۔۔۔ میری بیٹی کو بچالیں۔۔۔'' وہ بس اپنی بیٹی کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔ یقین تھا کہ بس وہی کر سکتا ہے۔ اور بس اسی کی ساری بادشاہت ہے، اُسی کا سب کچھ ہے۔ وہی کر سکتا ہے۔۔۔ بس وہی۔۔۔

گنہگار کا سہارا بھی اللہ۔۔۔

کافر کا سہارا بھی اللہ۔۔۔

بھٹکے ہوؤں کا سہارا بھی اللہ۔۔۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

----------+---------+--------

''اپنے بھائیوں کو بتا دیا ہوتا تو وہ آجاتے۔ دونوں فارغ ہی تو تھے۔ اب بلا وجہ اتنے بھاری بھاری سامان یہاں وہاں گھسیٹنے پڑ رہے ہیں۔'' جزا کی ماں نے اُسے ٹیبل گھسیٹتے ہوئے دیکھ کر تاسف سے کہا۔ یہ ایک جملہ وہ صبح سے ڈیڑھ ہزار مرتبہ کہہ چکی تھیں۔ اُنہوں نے آج ہی اپنا گھر تبدیل کیا تھا، اور تبادلے کے سارے مراحل جزا نے اکیلے ہی طے کیے تھے۔ بنا کسی کی مدد کے۔

''آپکے بیٹے فارغ نہیں ہیں، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چھٹیاں منا رہے ہیں۔ اور ویسے بھی اُنہی کی وجہ سے ہم اس حال میں ہیں'' وہ ہمیشہ ایسے ہی صاف گوئی سے کام لیتی تھی۔

''جب دیکھو اپنے بھائیوں کے خلاف زہر اگلتی رہتی ہو۔'' اُنہوں نے ناراضگی سے کہا تو وہ چپ ہی رہی۔

''اب یہ جھاڑو کہاں ہے؟ مجھے کمرے کی صفائی کرنی ہے'' اُس نے جھنجھلا کے یہاں وہاں دیکھا۔

''جھاڑو ساتھ لانی تھی کیا؟'' اُسکی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا مطلب امی؟ آپ جھاڑو اُسی گھر میں چھوڑ آئی ہیں؟''

''جانے دو نہ، کل ماسی صفائی کرنے آئے گی تو وہ دیکھ لے گی۔''اُنہوں نے معصومیت سے بات بدلی تھی۔

''امی یار!۔۔۔''وہ بیزار ہوئی۔

''یار مت کہا کرو مجھے، کتنی مرتبہ کہا ہے؟''وہ پھر سے غصّہ ہوئی تھیں۔

''مجھے اپنا کمرہ آج ہی سیٹ کرنا ہے۔سارا دن پڑا ہے،اب میں ماسی کے انتظار میں ضائع تو نہیں کر سکتی''

''تو اب کہاں سے لاؤں جھاڑو؟ کہہ تو رہی ہوں کہ بھول آئی ہوں وہیں پر''اب کہ انہوں نے بھی بیزاری سے کہا۔

''ایک کام کرتی ہوں،آس پڑوس میں کسی عورت سے مانگ لیتی ہوں۔''

''اے ہے۔۔۔پاگل ہو گئی ہے کیا؟اب محلے والوں سے جھاڑو مانگتی اچھی لگو گی کیا؟ویسے بھی یہ ہمارے پرانے محلے جیسا علاقہ نہیں ہے۔ ہر طرف بنگلے ہیں، پتہ نہیں لوگ کیا سوچیں گے؟''

''ہاں تو یہ امیروں کا علاقہ بھی آپکے بیٹے نے ہی ڈھونڈا ہے۔میرے اوپر بھروسہ کرتیں نہ تو اپنے ہی جیسے کسی علاقے میں گھر لیتیں، کم از کم لوگ تو اپنے جیسے ہوتے''اُسکا پسندیدہ موضوع اپنے بھائیوں کی برائی کرنا تھا۔

''اتنا اچھا تو گھر ہے،اتنا صاف ستھرا علاقہ ہے۔اور کون سا کرایہ تمہاری جیب سے جا رہا ہے؟بھائی ہی دے رہا ہے تمہارا۔'' وہ سخت بدمزہ ہوئیں۔گفتگو کا رخ پھر اُنکے بیٹوں کی جانب مڑ چکا تھا۔

''تو احسان نہیں کر رہا کوئی،اس حال میں ہم آئے بھی اُن دونوں کی وجہ سے ہی ہیں۔خیر۔۔''وہ کہتے کہتے رکی،اپنی ماں کے چہرے پر غضبناک تاثرات دیکھ چکی تھی۔

''میں جاتی ہوں،پڑوس سے جھاڑو لیکر آتی ہوں۔میں نے ایک بزرگ خاتون کو دیکھا تھا صبح وہاں''

''پاگل ہو گئی ہو؟کیوں پہلے دن ہی پینڈوؤں والی حرکت کرنا چاہتی ہو؟''اُسکی ماں اپنا سر پیٹ رہی تھیں۔لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔اس بنگلے کو اُسکے بڑے بھائی نے اُنہیں کرائے پر لے دیا تھا۔بنگلے کی اوپر والی منزل بند تھی۔اُنکی رسائی بس نیچلی منزل تک ہی تھی۔ مالک مکان بھی اس ملک میں نہیں رہتا تھا۔لان کی دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئی تھیں۔وہ اس بنجر لان کو دیکھتی،

مستقبل کیلئے اسکا حل سوچتی گھر سے باہر آئی۔ پھر پڑوس میں بنے اس خوبصورت سے گھر کو دیکھا اور بیل بجادی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا۔ وہی بزرگ خاتون جسے اُس نے صبح یہاں دیکھا تھا، دروازے پر تھیں۔

''کیا بات ہے بیٹی؟'' اُنہوں نے اتنی نرمی سے سوال کیا کہ وہ تو کھڑے کھڑے ہی اُنکی پرستار ہو گئی۔ خود وہ دھوپ کے مخالف کھڑی تھی، اُسکا چہرہ خاتون کو ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔

''جی میں! صبح ہی پڑوس میں شفٹ ہوئی ہوں، اصل میں۔۔۔''

''باہر ہی کھڑی ہو کر بات کرو گی؟ اندر آؤ'' اُسکی بات پوری ہونے سے پہلے ہی خاتون نے دروازہ پورا وا کرتے ہوئے کہا اور خود کنارے ہو گئیں تاکہ وہ اندر آسکے۔ جز اتذبذب کا شکار کھڑی رہی، ایسے ہی کسی انجان کے گھر کیسے چلی جاتی؟

''آجاؤ! اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا'' اُنہوں نے ایک بار پھر نرمی سے کہا تو وہ جھجھکتے ہوئے اندر آئی۔ خاتون نے اُسکے پیچھے دروازہ بند کیا اور اُسکی جانب مڑیں۔

''اصل میں ناں! میرے پاس پورا دن پڑا ہے۔ اور مجھے گھر کی صفائی بھی کرنی ہے۔ لیکن کیا کروں میری امی بھی جھاڑو پرانے گھر چھوڑ آئی ہیں۔ اوپر سے گھر بھی اتنا گندا۔۔۔'' وہ اب دھوپ کے مقابل کھڑی اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔ صبح نو بجے کی چمکتی ہلکی دھوپ میں اُسکا چہرہ واضح ہوا تو خاتون اُسے دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئیں۔ سانولی رنگت پر سجی بے حد سیاہ آنکھیں، کھڑے اور بلکل برابر نین نقش، جیسے قدرت نے پرکار سے ناپ کر بنائے ہوں۔ چھوٹی سی پتلی اور کھڑی ناک، جس پر چمکتی لونگ ایسے تھی جیسے بنی ہی اسکے لیے ہو۔ پتلے اور چھوٹے سے ہونٹ، مسکراتی تو چیک بونز نمایاں ہوتی تھیں۔ لہروں کی مانند بل کھاتے گھنگریالے بال کیچر میں مقید تھے۔ بے حد سیاہ آنکھوں میں بھر بھر کر لگایا گیا کاجل اُسکی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ خاتون کو ماننا پڑا کہ اُنہوں نے آج تک کسی کی آنکھوں میں کاجل اتنا جچتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، جتنا اُس پر جچ رہا تھا۔ وہ سانولی رنگت والی لڑکی بلاشبہ بے انتہا خوبصورت اور پرکشش تھی۔

جیسے مرہٹ کی کوئی گمشدہ شہزادی۔۔۔

یا دیواروں میں چنوائی گئی، سلیم کی انارکلی۔۔۔

کتنی ہی دیر وہ یک ٹک اُسے دیکھے گئی تھیں۔ وہ اتنی پرکشش تھی کہ مقابل کو چند لمحوں کے لیے آس پاس بھلا دے۔ خوبصورتی کی زندہ مثال۔۔۔

''آنٹی؟ آپ سن رہی ہیں نہ؟'' وہ بے خیالی سے جزا کو دیکھے جا رہی تھیں کہ اس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹی! سن رہی ہوں، تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں جلدی ہے تو اسی لیے آج اندر نہیں بلا رہی۔ میرا ملازم تمہیں مطلوبہ سامان دے جائیگا۔ دوپہر کو جب بچے آئینگے تو میں اُنہیں بھی تمہاری مدد کے لیے بھیج دوں گی۔''

''بچے؟''

''ہاں! میرے بچے، ابھی اسکول گئے ہوئے ہیں''

''نہیں نہیں آنٹی! بچوں کو تنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کر لوں گی خود''

''پریشان نہ ہو، میرے بچے خوشی خوشی تمہاری مدد کو راضی ہوں گے۔ پھر جب تمہارا گھر سیٹ ہو جائے تو میرے گھر آنا ناشتے پر، امی کو بھی لانا''

''شکریہ آنٹی آپکا'' وہ مشکور ہوتی جانے کے لیے مڑی۔

''عائشہ۔۔۔۔'' اُنہوں نے کہا۔

''جی؟'' اُس نے رک کر نا سمجھی سے اُنہیں دیکھا۔

''عائشہ نام ہے میرا، بچے مجھے عائشہ جی کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے عائشہ جی کہو تو اچھا لگے گا'' اُنہوں نے نرمی سے کہا تو جزا کو حیرت ہوئی کہ اُنکے بچے اُنہیں امی کہنے کے بجائے عائشہ جی کیوں کہتے ہیں؟

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ اُن سے رخصت ہو کر وہ باہر آئی۔ اور گھر کے باہر لگی اس تختی کو دیکھا جس پر گھر کا نام جلی حروف میں لکھا تھا۔

''پناہ گاہ''

----------+---------+--------

آج کل کام بہت زیادہ تھا، اُسکی تین بڑی ٹیموں میں سے دو تو اب تک کام کے لیے گئی ہوئی تھیں، جب کہ تیسری ٹیم آفس میں ہی اندرونی کام سرانجام دے رہی تھی۔ اُسکی مصروفیات بھی کافی زیادہ تھیں۔

بلیو جینز پر آف وائٹ شرٹ پہنے اور اُس پر نیوی بلیو جیکٹ ڈالے، وہ اس وقت بھی فائلوں میں سر کھپائے بیٹھا تھا۔ ٹیبل پر رکھی چائے کا بڑا سا مگ کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

''سر! میں اندر آ جاؤں'' دروازے پر کھڑے اُسکے سکریٹری نے دستک دے کر اندر آنے کی اجازت چاہی تھی۔ اُس نے چہرہ اٹھایا، کام کی زیادتی اور بوجھ سے اُسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''ہاں! آ جاؤ''

''سر! میرا کام ہو گیا ہے۔ میں جا سکتا ہوں؟'' اُس نے پوچھا تو مقدّم نے حیران ہوتے ہوئے ہاتھ میں بندھی گھڑی دیکھی۔

''سات بج گئے؟ باقی سب کہاں ہیں؟'' وہ حیران ہوا۔ کام میں اتنا مصروف تھا کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔

''سب تقریباً جا چکے ہیں، ایک دو رہ گئے ہیں وہ کام مکمل کر رہے ہیں''

''ٹیم آ گئی؟''

''ٹیم احتشام کا کام مکمل ہو گیا ہے، راستے میں ہے آدھے گھنٹے تک پہنچ جائیگی۔ ٹیم بدر ابھی تک کلائنٹ کے آفس میں ہی ہے'' اُس نے تفصیل سے بتایا۔

''ہمم۔۔۔ ہمارے آفس میں جو لوگ اوور ٹائم کر رہے ہیں، اُن میں خواتین کتنی ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''پانچ لوگ اوور ٹائم کر رہے ہیں، دو خواتین ہیں۔''

''خواتین سے کہو کہ لیپ ٹاپ لیکر گھر چلی جائیں اور رات تک کام مکمل کر کے بھیج دیں۔ مرد اگر رکنا چاہیں، تو رک کر کام مکمل کر لیں ورنہ وہ بھی گھر سے کام کر سکتے ہیں'' اُس نے حکم دیتے ہوئے واپس فائل میں سر جھکایا۔

''ٹھیک ہے سر! میرے خیال سے آپ کو بھی گھر جانا چاہیے۔'' سیکریٹری نے کہا۔

''کیوں؟''

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی'' اُس نے مقدّم کا سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

''نہیں! میں ٹھیک ہوں، کچھ چیزیں مکمل کرلوں پھر چلا جاؤں گا۔ تم بھی جا سکتے ہو'' اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے!'' وہ چلا گیا۔

مقدّم نے بھی کچھ دیر میں اپنا کام مکمل کیا اور گردن سیدھی کرنے کے لیے کرسی سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ چھت اُسکے سامنے تھی اور وہ کل کے واقعات کو سوچ رہا تھا۔ رضا، عمر، علی اور نوید کو سوچ رہا تھا۔ اُنکی بے اعتنائی یاد کر رہا تھا۔ عمر کی گم صم نظروں کو یاد کر رہا تھا۔

اُنہیں کون قتل کرنے والا تھا؟ کون اُسکا دشمن تھا؟ اس سب سے زیادہ حیران کن اُسکے لیے اُن سب کا رویّہ تھا۔ کیا ہوا تھا آخر اُن سب کو؟ کیوں اس طرح کھڑے تھے جیسے جانتے تک نہ ہوں؟ چلو مقدّم کے بنا بتائے جانے پر اگر وہ صرف اُسکے ساتھ ہی ایسا رویہ رکھتے تو کوئی بات بھی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے ساتھ وہ اسطرح کیوں کر رہے تھے؟ اُسے نہیں یاد تھا کہ کبھی وہ اپنے دوستوں میں کھڑا ہوا اور اُسے اس حد تک گھٹن محسوس ہوئی ہو۔ کل جب تک وہ وہاں رہا، اُسکا دل کیا کہ وہاں سے کہیں دور بھاگ جائے۔

''آخر کیا ہوا تھا میرے جانے کے بعد؟'' سوچ سوچ کر دماغ پک رہا تھا۔ چھت پر نِگاہیں ہنوز مرکوز تھیں۔ میز پر رکھا فون بج اٹھا، اُس نے سیدھے ہو کر سکرین پر نظر آتے نام کو دیکھا۔

''اخلاق کالنگ'' نام دیکھ کر یکلخت ہی اُسکی پریشانی غائب ہوئی تھی۔ چہرے پر عقیدت مندانہ مسکراہٹ در آئی۔ فون اٹھا کر کان سے لگایا اور دوبارہ کرسی پر گر گیا۔

''یاد آ گیا کہ تمہارا کوئی بھائی بھی ہے؟'' اُس نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

''ابھی پرسوں ہی بات کی تھی تم سے۔۔۔'' دوسری جانب اخلاق ہلکے سے ہنسا۔

''اور کل؟'' وہ چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

''اوہ خدا!۔۔۔بچوں کی طرح کرتے ہو تم کبھی کبھی، یاد کرو! کل جناب خود مصروف تھے۔ میرے میسیج کا جواب بھی رات کو دیا تھا۔اب بتاؤ ذرا، تم کہاں تھے کل سارا دن؟''

''میں؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔اُسے بتائے یا نہ بتائے؟ وہ پریشان ہو جائیگا۔

''ہاں ہاں! تم۔۔۔'' وہ برا پھنسا تھا۔

''میں نے کہاں ہونا ہے؟ کام اتنا زیادہ ہوتا ہے آج کل، اُسی میں مصروف ہوتا ہوں۔ابھی بھی آفس میں ہی ہوں۔'' اُس نے اصل بات چھپانا مناسب سمجھا تھا۔

''اچھا چلو! تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے'' اُسکے آسودہ لہجے پر مقدّم سیدھا ہو بیٹھا۔

''تم کراچی آرہے ہو؟''

''نہیں بھائی!۔۔۔تمہاری تان ہمیشہ میرے کراچی آنے پر ہی کیوں ٹوٹتی ہے؟'' وہ اُسکے بچپنے پر ہنسا تو وہ بیزار ہو کر واپس کرسی پر ڈھے گیا۔

''کیونکہ میری تو ایک ہی خوشی ہے کہ تم کراچی آؤ اور آکر ابا کی فرم سنبھالو تاکہ میرا بوجھ کچھ کم ہو''

''نہ۔۔۔میں اپنی سیاحت میں خوش ہوں۔یہ بوجھ تمہیں مبارک''

''پھر کونسی خوشخبری سنانے کو فون کیا ہے؟'' اُس نے جل کے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا نہ کہ مکرم کے لیے کیئر گیور (caregiver) کا انتظام کردوں'' کچھ ماہ سے مقدّم اپنے بیٹے کے لیے کیئر گیور کی تلاش میں تھا اور مکرم کے لیے وہ کسی پر اتنی آسانی سے بھروسہ بھی نہیں کرتا تھا۔اسی لیے اخلاق کو کہا تھا۔

''ہاں! تو کیا مل گئی؟''

''یہی سمجھ لو، وہ کیئر گیور تو نہیں لیکن مکرم کی ذمے داری بانٹنا چاہتی ہیں''

''کس کی بات کر رہے ہو؟ کھل کر بتاؤ۔''

''شیریں کی بہن، جو ڈاکٹر بن رہی تھی۔ وہی ملی تھی پچھلے دنوں مجھ سے''

''شیریں کی بہن؟ وہ تو کافی چھوٹی نہیں تھی؟'' مقدّم کو یاد آیا۔

''اب ساری زندگی چھوٹی تو نہیں رہے گی نہ؟ ڈاکٹر بن گئی ہے۔ ہاؤس جاب بھی مکمل کر لی ہے اُس نے، اب کراچی کے کسی نجی ہسپتال میں نوکری لگی ہے اُسکی تو اسی لیے کراچی شفٹ ہو رہی ہے۔ مجھ سے مکرم کے سلسلے میں ہی ملنے آئی تھی۔'' وہ تفصیل سے بتا رہا تھا۔

''مجھے اُسکا نام بھول گیا ہے'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا

''مقدّس۔۔۔ مقدّس نام ہے اُسکا''

''ہمم۔۔۔ لیکن میں اس کو مکرم کی ذمے داری کیوں دوں؟ اور اُس پر بھروسہ ہی کیوں کروں؟'' اس سوال پر دوسری جانب خاموشی چھائی رہی تھی۔

''یہ تم پوچھ رہے ہو؟ تم جانتے ہو کہ وہ مکرم کی خالہ ہے۔ سگی خالہ۔۔۔'' کافی دیر بعد اخلاق سنجیدگی سے بولا تھا۔

''ہاں لیکن! کیا تم بھول گئے کہ اُن لوگوں نے پچھلے دو سالوں سے اُسکی کوئی خبر نہیں لی ہے؟ اب میں کیسے اپنے بچے کے لیے اُن کا احسان لوں؟''

''وہ مکرم سے ملنا چاہتی ہے۔ خالہ ہے اُسکی، دل میں محبت تو ہوگی نہ۔''

''اور تم نے اُسے پوری ذمے داری ہی دے دی؟'' وہ ناراض ہوا۔

''اِس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم کسی غیر پر بھروسہ کرو، اُس سے اچھا نہیں کہ مکرم کے خون پر ہی بھروسہ کر لو؟ وہ کسی بھی کیئر گیور سے زیادہ خیال رکھے گی اُسکا۔ اور ویسے بھی خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے'' وہ رسانیت سے سمجھا رہا تھا۔

''پچھلے دو سالوں سے میں نے اُسے اکیلے پالا ہے۔ اُن لوگوں نے پوچھا تک نہیں، اب میں کیسے مان لوں کہ اچانک سے اُسکی یاد آ گئی؟ مجھے بھروسہ نہیں ہے اُس پر۔۔۔'' اُس نے قطعی لہجے میں کہا تو اخلاق نے گہری سانس لی پھر گویا ہوا۔

''بے شک تم بھروسہ نہ کرو، لیکن تم اُسے مکرم سے ملنے سے روک تو نہیں سکتے نا؟ وہ اُسکی سگی خالہ ہے''

''اگر وہ خالہ ہے تو میں بھی۔۔۔'' وہ تیزی سے کہتے کہتے رکا اور پھر رکا ہی رہ گیا۔

''میں تمہیں یہی سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ کوئی بھی مکرم کو تم سے نہیں چھین رہا۔ مقدّس بھی مجبور تھی ان روایتوں کی وجہ سے، اسی لیے نہیں آسکی کبھی ملنے، لیکن اب اس کے پاس موقع ہے۔ اور دیکھو! وہ بس ملنا ہی تو چاہتی ہے۔ میں نے کب کہا کہ کیئر گیور کے طور پر رکھ لو اُسے، پہلے دیکھو، پرکھو اور اگر ٹھیک لگے تو سو بسم اللہ۔۔۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میرا کوئی حق نہیں مکرم پر؟'' ساری باتوں سے اس نے یہی اخذ کیا تھا بس۔

''تم اتنا غلط کیوں سوچتے ہو؟ میں نے کب کہا کہ تمہارا حق نہیں ہے؟ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم اُسکے باپ نہیں ہو۔'' سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ مقدّم کو بھی اس وقت وہ کڑواہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''کب تک آئیگی وہ؟'' اُس نے بہت ہی سنجیدہ لہجے میں پوچھا تھا۔

''کل یا پرسوں تک'' اخلاق نے گہری سانس بھرتے ہوئے بتایا۔ یقیناً وہ روٹھ چکا تھا۔

''تمہارا ایڈریس دے دیا ہے، پہنچ جائیگی۔ تم پہچان تو لوگے نہ؟''

''معلوم نہیں، اُسے جب دیکھا تھا تو وہ بہت چھوٹی تھی۔ خیر! آئیگی تو مل لوں گا۔ ابھی مجھے کچھ کام ہے۔ پھر بات کروں گا تم سے'' سنجیدگی سے کہتے وہ فون رکھنے لگا۔

''ناراض ہوگئے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا تو وہ رکا۔

''بعد میں بات کرتے ہیں'' اُس نے بس اتنا ہی کہا۔

''ٹھیک ہے، خیال رکھنا اپنا'' اُس نے بھی فون کاٹ دیا۔

وہ ٹیبل پر فون پھینکتے ہوئے ماتھا مسلنے لگا تھا۔ مکرم اُسکا بیٹا نہیں تھا۔ یہ بات وہ کیوں بھول جاتا تھا؟

----------+---------+--------

میک اپ آرٹسٹ نے بڑی مہارت سے اُسکے چہرے پر آئے زخم اور آنکھوں کے نیچے چھائے حلقے چھپائے تھے۔ سفید میکسی پر گلابی رنگ کا دوپٹہ ڈالے وہ تیار تھی۔ اُسکی بیٹی پاس ہی بیٹھی کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔

وقت قریب آرہا تھا، اور اُسکا دل ڈوبتا جارہا تھا۔

مت کرو فاطمہ! دیکھو احمد کتنا چھوٹا ہے۔ کیسے رہے گا تمہارے بنا؟

کسی کے التجا کرتے الفاظ کانوں میں گونجے۔ بڑے غلط وقت پر علی یاد آیا تھا۔

میں تمہاری ہر غلطی معاف کردوں گا، کبھی بھول کے بھی ذکر نہیں کروں گا ماضی کا، لیکن یہ مت کرو۔ واپس چلو میرے ساتھ۔ تمہارا بیٹا برباد ہو جائیگا

کتنی تڑپ تھی اُسکی آواز میں؟ لیکن فاطمہ تب اندھی، بہری، گونگی سب ہو گئی تھی۔ اُسکے سر پر تو شیطان سوار تھا۔ وہ کیسے اُسکی بے لوث محبت کو پہچانتی۔ لیکن اب کیا فائدہ تھا پچھتانے کا؟

''اب کیوں رو رہی ہو؟ یہ تو یہاں آنے سے پہلے سوچنا تھا نہ'' اُسے تیار کرنی والی آرٹسٹ نے کہا تو وہ ساکت ہوئی۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' اُس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''میں سب جانتی ہوں، میں بھی اسی آدمی کے جال میں پھنسی تھی کبھی، بعد میں بہت پچھتائیں، لیکن کیا فائدہ؟ اب میں نے اپنی قسمت سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔ تم بھی کرلو'' وہ بیگانگی سے کہہ رہی تھی۔

''میں اپنی قسمت سے سمجھوتہ کرلیتی لیکن میں اپنی بیٹی کا کیا کروں؟ جسے یہ آدمی بیچ دے گا یا مار دیگا۔'' اُس نے دکھ سے کہا تو اس عورت نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تمہاری بیٹی بھی ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں!۔۔اور میرے کیے کی سزا اب وہ بھگتے گی'' وہ سر جھکائے ہچکیوں سے رودی۔ وہ عورت کچھ دیر اُسکی بیٹی کو دیکھتی رہی، پھر گویا ہوئی۔

''یہاں سے ہلنامت میں ابھی آ رہی ہوں۔۔'' وہ آہستہ سے کہتی باہر نکل گئی، جبکہ خود وہ سر جھکائے روتی رہی، کچھ ہی دیر میں وہی عورت واپس آگئی۔

''یہ لو، اسے پہنو اور جب تک میں نہ کہوں یہاں سے باہر مت آنا'' اُس نے ایک کالے رنگ کی شے اُسکی جانب بڑھائی تو وہ حیران ہوتی اُس چیز کو کھولنے لگی۔ وہ ایک عبایا تھا۔

''یہ؟'' اُس نے نا سمجھی سے پوچھا۔

''میں تمہاری بیٹی کو برباد نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں یہاں سے نکالنا میرا کام ہے۔ اور یہاں سے آگے اپنی اور اپنی بیٹی کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ دوبارہ باہر چلی گئی۔ تو کیا اللہ کی مدد آگئی تھی؟! اتنی جلدی؟ فاطمہ نے سوچا۔

باہر آتے ہی پہلے اُس نے گارڈ کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت تقی گھر پر نہیں ہے۔

''وہ بھاگ گئی۔۔۔ وہ بھاگ گئی۔۔'' عورت نے اچانک ہی باآواز بلند چیخنا شروع کر دیا۔ گارڈز اسکو چلاتا دیکھ کر حرکت میں آئے۔

''وہ پیچھے والے دروازے سے بھاگی ہے، تمام گارڈز کو جمع کرواور اُسکے پیچھے جاؤ۔ تقی صاحب کے آنے سے پہلے اُسے ڈھونڈو، ورنہ ہم مارے جائیں گے۔'' چلا چلا کر بولتی وہ اُن سب کے چھکے چھڑا رہی تھی۔ گارڈز تیزی سے پیچھے کے دروازے کی جانب دوڑے تھے۔ فاطمہ کے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔

''جلدی کرو، وہ زیادہ دور نہیں گئی ہو گی'' وہ مزید بلند آواز میں بولی۔ جب تقریباً سارے گارڈز ہی پیچھے کی طرف چلے گئے تو وہ اندر آئی۔ فاطمہ عبایا پہنے تیار کھڑی تھی۔

''جلدی کرو، وہ سب اس وقت حواس باختہ ہیں۔ اسی لیے تمہیں ڈھونڈنے نکل گئے ہیں۔ اب اسی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر تم سامنے سے نکل جاؤ۔ جلدی کرو۔۔۔'' وہ کہہ کر اُسے باہر دھکیلنے لگی۔ اُسکی بیٹی اُسکی گود میں تھی۔

''اور تم؟'' فاطمہ نے رک کر اُسے دیکھا۔

''میری فکر نہ کرو۔ ابھی میرا وقت نہیں آیا۔ لیکن تم اپنی بیٹی کو بچا لو۔'' وہ اُسے باہر کی طرف لے جانے لگی۔

''رک جاؤ، مجھے سامنے والے دراز سے اپنے طلاق کے کاغذات چاہیے'' فاطمہ نے ایک کمرے کی جانب رک کر اشارہ کیا۔ یہ کمرہ اور اُسکے دراز ہمیشہ لاک رہتے تھے۔ لیکن آج سب کھلا تھا۔ اُس نے اپنے رب سے مانگا تھا، اُسکے رب نے ہر شے اُسکے لیے آسان کردی تھی۔ اُس نے وہ سب کردیا تھا، جو ناممکن لگتا تھا۔ اسباب اُسکے محتاج ہیں، وہ اسباب کا محتاج تھوڑی ہیں؟

''جاؤ جلدی لیکر آؤ۔'' عورت نے کہا تو فاطمہ بھاگ کر اندر گئی۔ اور سب کچھ آسان کرنے والے اُسکے رب نے یہ بھی آسان کردیا۔ پہلے ہی دراز میں سب سے اوپر طلاق کے کاغذات رکھے تھے۔ وہ کاغذات لیکر جلدی واپس آئی اور وہ لوگ پورچ میں پہنچے، وہاں گارڈز نہیں تھے۔

''فوراً نکلو یہاں سے، اور پلٹ کر مت دیکھنا''

''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ اپنا نام بتادو'' اُس نے عورت کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''چلی جاؤ۔۔۔ جاؤ یہاں سے، جاؤ۔۔'' وہ چلاتے ہوئے اُسے دھکیلنے لگی۔ فاطمہ اپنی بیٹی کو لیکر بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ پتہ نہیں کیسے لیکن کسی گارڈ کی نظر اُس پر پڑ گئی۔ اُس نے اُسے پہچان لیا حالانکہ وہ عبایا پہنی ہوئی تھی۔

''وہ بھاگ رہی ہے۔۔۔ پکڑو اُسے۔۔۔۔ گاڑیاں نکالو وہ بھاگ نہ جائے۔۔۔'' تقی کے حوارین چلا چلا کر سب کو مطلع کر رہے تھے۔ رات کے اس وقت اُس ولا میں کہرام مچ گیا تھا۔۔

وہ اپنی بیٹی کو لیکر بھاگ رہی تھی۔ نہ راستے کا پتہ نہ منزل کا تعین۔۔۔ بس پرواہ تھی تو یہ کہ اپنی بیٹی کی جان بچانی ہے، یا جان دے دینی ہے۔

''امی پاؤں میں درد ہو رہا ہے'' اُسکی تین سالہ بیٹی نے کراہتے ہو کہا۔

''بس تھوڑی دیر بیٹا!''

''نہیں میں اور نہیں بھاگوں گی'' اُسکی بیٹی نے اُسکا ہاتھ چھوڑا۔ اُس نے رک کر اپنی بچی کو دیکھا۔ وہ واقعی اتنا نہیں بھاگ سکتی تھی۔ پھر اُس نے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھایا۔ اُن کے تعاقب میں آنے والوں کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔

اُس نے بچی کو لیکر دوڑنا شروع کیا، کافی دیر چھپتے چھپاتے وہ بلآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی، جہاں خانہ بدوشوں کی پوری خیمہ بستی آباد تھی۔

اُس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھایا اور اُس بستی میں جا گھسی۔ کچھ دیر وہ ایک پرانی چادروں سے بنے خیمے کی آڑ میں بیٹھی رہی، جب اُسے احساس ہوا کہ اُسکے تعاقب میں آنے والے آگے چلے گئے ہیں، تو اُس نے سکھ کا سانس لیا۔

''کون ہو تم؟'' ابھی وہ سکون سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ کسی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ وہ ڈر کر اچھلی۔

''کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟ دیکھنے میں تو کسی اچھے خاندان کی ہو۔۔ کس سے بھاگ کر اس گندی بستی میں آئی ہو؟'' بوڑھی عورت نے پے در پے سوالات کیے تھے۔

''میں مجبور ہوں، میری مدد کرو۔ وہ میری بیٹی کو مار دینگے'' اُس نے روتے ہوئے کہا۔

''کون مار دینگے؟'' بوڑھی عورت اُسکے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''وہ۔۔۔ میرا شوہر۔۔۔ اور اُسکے آدمی۔ وہ میری بیٹی کو امیر آدمی کو بیچنا چاہتے ہیں۔ میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں۔ یا تو وہ اسے بیچ دینگے یا مار دینگے''

''میں تو سمجھتی تھیں کہ یہ قباحتیں ہم غریبوں میں ہیں۔ امیر بھی اسی گندگی کا حصہ ہیں۔ خیر! تم فکر نہ کرو۔ یہاں چھپی رہو، جب تک تمہیں اُسکا خوف ہے۔ آگے میرا خیمہ ہے، میرے ساتھ میری پوتی ہوتی ہے'' وہ کھڑی ہوئی اور ان دونوں ماں بیٹی کو پیچھے آنے کا کہا۔

''ہم دونوں گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔ لیکن تم پریشان نہ ہو۔ آنے والا اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔'' بوڑھی عورت اُسکے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مختلف خیموں کے درمیان سے ہوتے ہوئے وہ اُسے ایک پرانے گندے سے خیمے میں لے آئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اُس نے خیمے کے آگے رک کر اُس سے پوچھا۔

''فاطمہ۔۔۔ فاطمہ آفندی'' اُس نے اپنا نام بتایا۔

''اندر آ جاؤ'' وہ عورت اُسے اندر لے آئی۔ اُسکے بعد ایک ہفتہ فاطمہ، اُس عورت کے پاس رکی رہی۔ وہ روکھی سوکھی جو کھانے کو دیتی وہ صبر شکر سے کھا لیتی، یہاں تک کہ اُسکی بیٹی بھی خاموشی سے فاقے کر رہی تھی۔ ایک وقت دودھ مل جاتا تو پی کر سو جاتی۔ یہاں سے چند

قدم کے فاصلے پر، ہی اُسکے سابقہ شوہر کا گھر تھا لیکن وہ اُسے ڈھونڈ ھنے میں ناکام تھا۔ اُس نے بس ایک بار اللہ سے مدد مانگی تھی اور اللہ ناجانے کہاں کہاں سے اُسکے لیے وسائل بنا رہا تھا۔ کیونکہ وہ اللہ تھا، پوری کائنات اُسکی تھی تو یہ چھوٹے موئے مسئلے کیا بیچتے تھے اُسکے آگے؟

پورے ہفتے بعد جب اُسے لگا کہ اُسکی تلاش ختم ہو گئی ہے، تو اس نے بوڑھی عورت سے جانے کی بات کی تھی۔

''میں تمہیں یہاں کے مقامی لباس میں کل صبح تانگے والوں کے ساتھ بھیج دوں گی۔''

''تانگے والے کے ساتھ؟''

''ہاں! صبح یہاں کی ساری عورتیں و بچے تانگے پر نکلتے ہیں اور کام کے لیے شہر کی طرف جاتے ہیں، تم بھی ساتھ بیٹھ جانا۔ کوئی تمہیں پہچان نہیں سکے گا'' وہ علاقہ شہر کے مضافات میں تھا۔ ایک جانب پوش آبادی تھی تو دوسری جانب یہ خانہ بدوش بستی تھی۔ وہ ان محسنوں کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔ اگلے دن اُس نے وہی کیا جو بوڑھی عورت نے کہا تھا۔ اُنکا مقامی لباس پہنے، چادر سے چہرہ ڈھانپے، وہ تانگے میں سوار تو ہو گئی لیکن اب جہاں وہ جا رہی تھی، پتہ نہیں وہ لوگ اُسے قبول بھی کرنے والے تھے یا نہیں؟

----------+---------+--------

آج وہ کافی دنوں بعد اپنی پرانے معمول کے مطابق گھر آیا تھا۔ ورنہ پچھلے کئی روز سے اُسے ڈیوٹی پر آدھی آدھی رات گزر جایا کرتی تھی۔ سنسان پورچ سے ہوتا وہ گھر میں داخل ہوا تو لاؤنج بھی خاموش پڑا تھا۔ کچن سے البتہ غیر معمولی طور پر کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ وہیں چلا آیا۔

''سلام صاحب۔۔۔'' اُسے دیکھ کر سرکاری ملازمہ نے اُسے سلام کیا۔ بشریٰ پاس ہی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی، اُسکے دونوں بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر مسکرائی جواباً، وہ بھی نرمی سے مسکرا دیا۔

''تم جلدی آ گئے؟'' اُس نے پلیٹیں اٹھا کر ملازمہ کو دیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! کام کم ہے آج کل''

''کھانا کھاؤ گے ؟''

''ہاں !'' مختصر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم منہ ہاتھ دھولو۔'' وہ سر ہلاتے جانے لگا۔

''صاحب میں جاؤں ؟'' ملازمہ کی آواز پر رکا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔

''ٹھیک ہے جاؤ'' اُسے اجازت دیتا وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کالی کاٹن کی جیکٹ اُتار کر بستر پر رکھی، گھڑی اور والٹ رکھنے کے بعد جینز کی بیلٹ میں رکھی اپنی گن نکال کر دراز میں ڈالی اور واشروم چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اُسی سفید پوری آستینوں والی پولو شرٹ پہنے، دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ کچن میں موجود تھا۔ جہاں بشریٰ اُسکا کھانا گرم کرکے میز پر رکھ چکی تھی، اور اب بچوں کو کچھ سمجھا رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی سردی ہے، اور دونوں آئس کریم کھانے کی ضد کر رہے ہیں'' اُس نے خفگی سے کہا تھا۔ نوید نے ایک نظر اپنے بچوں کی دیکھا اور بولا۔

''تمہیں گھر میں آئس کریم لا کر رکھنی ہی نہیں چاہیے تھی، اب بچے فریج میں دیکھیں گے تو ضد تو کریں گے۔'' اُس نے پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے کہا۔ بشریٰ کو اُسکا رویّہ بچوں کے ساتھ لاتعلق نہ صحیح لیکن لاڈ پیار والا بھی نہ لگتا تھا۔

''تو مجھے کیا معلوم تھا کہ اُنکی نظریں فریج تک پہنچ جائیں گی'' وہ چڑ کر بولی۔

''خیر ! اب ضد کر ہی رہے ہیں تو دے دو۔ یہ بتاؤ تم نے کھانا کھایا؟'' اُس نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔ بچوں کے موضوع پر وہ اتنی ہی دلچسپی دکھاتا تھا بس ! بشریٰ کو برا لگنے لگا۔

''کھا لیا تھا ان دونوں کو کھلاتے ہوئے'' وہ بیزاری سے کہتے ہوئے فریج تک گئی اور آئس کریم نکال کے سلیب پر رکھی، پھر دو الگ الگ پیالوں میں سکوپ کی مدد سے آئس کریم نکالنے لگی۔ اتنی دیر میں وہ بھی کھانا ختم کرکے برتن سنک میں ڈال چکا تھا۔ وہ آئس کریم کے

پیالے لیکر بچوں کے پاس آئی۔ دونوں اپنے اپنے کھلونوں میں مگن تھے۔ اُنکے سامنے پیالے لیے کھڑی رہی اور پھر کچھ سوچ کر اُس کی جانب مڑی۔

''آج تم ان دونوں کو آئس کریم کھلاؤ''اُس نے نوید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں!''مختصر سا جواب آیا۔ وہ کچھ دیر سوچ میں پڑا رہا، پھر اٹھ کر بچوں کے پاس آگیا۔ اُس کے ہاتھوں سے دونوں پیالے لیے اور خاموشی سے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر اُنہیں آئس کریم کھلانے لگا۔ وہ غور سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ بے حد سیاہ بالوں کے درمیان سے سرمئی مائل اور کچھ سفید بال جھانک رہے تھے۔ چہرہ اس وقت بے تاثر تھا، اتنے سال اُسکے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ اُسکا رویہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ ویسا پیار اور ویسی محبت نہیں دکھاتا تھا، جیسا پیار اور محبت ایک باپ کا ہونا چاہیے۔ اُنہیں آئس کریم کھلانے کے بعد اُس نے خاموشی سے پیالے اٹھا کر سنک میں ڈال دیئے۔ وہ بھی نیپ کن سے دونوں کا منہ صاف کرنے لگی۔

''چلو اب بس کرو، دونوں کے سونے کا وقت ہو چکا ہے۔''نوید نے اُسکے پاس آتے ہوئے کہا۔

''آج تم انہیں سلادو''وہ اُسے دیکھتا ہی رہ گیا، آج وہ انوکھی فرمائشیں کر رہی تھی۔

''پلیز''اُس نے التجا کی تو وہ گہری سانس لیتا جھکا پھر اُن دونوں کو گود میں اٹھائے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ بس اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔ وہ نوید کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ جتنا وہ اُسے بچوں کے قریب لانے کی کوشش کرتی تھی، اُسکی ایک فیصد کوشش بھی وہ خود سے نہیں کرتا تھا۔ بھلا کوئی اپنی سگی اولاد سے بھی اتنا بیگانہ رویہ رکھ سکتا ہے؟ وہ جتنا سوچتی اتنا اُلجھتی جاتی تھی۔

--------+-------+-----

رات کے دس بج رہے تھے، کام تو سات بجے ہی ختم ہو چکا تھا لیکن وہ آج بھی اپنی ٹیم کے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا، اسی لیے آفس میں رہا۔ نو بجے اُسکی ٹیم واپس آئی اور اُسے مختصراً تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد، تمام کام سمیٹ کر تمام لوگ باری باری چلے گئے، آفس تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اب وہاں صرف وہ ہی بچا، آخری آخری چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

کرسی کے برابر میں کھڑے، ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے وہ اُنہیں اپنے شیلف میں ڈال رہا تھا، جب دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔۔'' سرمئی پینٹ پر آف وائٹ شرٹ پہنے مقدّم نے بنا سر اٹھائے جواب دیا، پینٹ کا ہم رنگ کوٹ کرسی کی پشت پر پھیلا تھا۔ کالر کا بٹن کھلا تھا اور ٹائی غائب تھی، شرٹ کی آستینوں کے بٹن کھول کر اُسے کہنیوں سے ذرا نیچے کر کے، اُلٹا موڑ رکھا تھا۔ شکل سے کافی تھکا ہوا لگتا تھا۔ کاغذات اندر رکھتے اُسے اچانک ہی احساس ہوا کہ آفس میں وہ اکیلا تھا، تو پھر دستک کس نے دی؟ اگلے ہی لمحے اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اور ساکت رہ گیا۔

ایک لمحے کو سانسیں تھمیں تھیں۔ وہ جہاں تھا وہاں سے ہل بھی نہ سکا۔ یقین نہ آیا کہ وہ یوں اُس سے ملنے چلا آئیگا۔ بلیک پینٹ پر نیلی شرٹ پہنے، سینے پر بازو باندھے، اُسکے سامنے کھڑے عمر حفیظ کے چہرے کے تاثرات بھی مقدّم جیسے ہی تھے۔

''عمر!'' حیرانگی سے اُسکا نام لیا۔

''تم یہاں؟'' کل جب اُسے دیکھا تھا تو بہت دل کیا تھا اُس سے بات کرنے کو، لیکن کر نہیں پایا تھا۔

''کیسے ہو؟'' سینے پر بندھے ہاتھ کھول کر جیبوں میں ڈالتا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہ مقدّم کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ درمیان میں اب بس ایک میز تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم۔۔۔ تم بیٹھو'' اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ سر ہلاتا ہوا عمر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مقدّم بھی اپنی جگہ سنبھالتے، اُسکا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ سر جھکائے، میز کو دیکھ رہا تھا۔ بتانے کو بہت کچھ تھا، لیکن کہنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ؟ کیا پوچھے اور پوچھے بھی تو کیسے؟

''تم نے بتایا نہیں؟'' جب کافی دیر وہاں خاموشی رہی تو مقدّم نے خود ہی پوچھا۔ اُس نے نا سمجھی سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''یہی کہ تم اس وقت کیسے آئے؟'' حتیٰ الامکان لہجے کو پر سکون رکھا۔

''پتہ نہیں۔۔۔'' گم صم سے لہجے میں کہتے وہ مقدّم کو نارمل نہیں لگا تھا۔

''میرا دل کیا تم سے ملنے کو، تو بس آگیا'' عام سے لہجے میں کہتے وہ اُسے حیران کر گیا تھا۔ اور اسی لمحے وہ اُسے پرانا والا عمر لگا تھا۔ جو لمبی لمبی باتیں نہیں کرتا تھا۔ یہ وہ بھی نہیں تھا جو مہینے بھر پہلے اُسکے سامنے بیٹھا تھا اور وہ اُسے پہچان بھی نہ پایا تھا۔

اُس میں آج شناسائی آگئی تھی، پرانا تعلق آگیا تھا، دوستی آگئی تھی۔

''تم ٹھیک ہو عمر؟'' وہ چاہ کر بھی اجنبیت نہیں برت سکا۔ اس ایک انسان سے وہ زیادہ دیر اظہارِ لاتعلقی کر بھی نہیں سکتا تھا۔

''ہاں!'' مختصر جواب دیتے اُس نے مقدّم کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں اس دن یہاں آیا تھا، علی کے ساتھ اور۔۔'' وہ کوئی وضاحت دینا چاہتا تھا۔

''میں جانتا ہوں'' اُس نے بات کاٹی ''میں تم دونوں کو ہی پہچان نہیں سکا، شاید میرے تصوّر میں بھی نہیں تھا کہ سامنے تم لوگ ہو گے، اسی لیے۔۔۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تم دونوں تھے۔'' شروعات ہو رہی تھی، وضاحتیں دی جارہی تھیں، دراڑ بھرنے لگی تھی۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں پہنچانا عمر؟ تم مجھے بتا سکتے تھے۔ میرا نام لے سکتے تھے۔'' شکوے بھی ہونے لگے تھے۔ عمر حیران سا اُسے دیکھے گیا۔ ہاں! وہ شکوہ کر سکتا تھا۔ وہ دیوار گرانے میں پہل کر سکتا تھا۔ کیوں کہ جب جھگڑا ہوا تھا، تب وہ یہاں نہیں تھا۔ اُسکے لیے ہر شے آج بھی وہیں تھی۔ اُسکے لیے یہ آسان تھا۔

''مجھے لگا شاید تم مجھ سے بات نہ کرنا چاہو۔'' عجیب سی وضاحت تھی۔

''اور تمہیں ایسا کیوں لگا؟'' مقدّم واقعی بھول بیٹھا کہ وہ اس شخص سے دس سال بعد مل رہا ہے۔ اس نے اتنے سالوں کا فاصلہ چند لمحوں میں پاٹا تھا۔ اس بات کا جواب وہ نہیں دے سکا۔

''علی نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی'' وہ پوچھ رہا تھا۔ اور جواباً وہ اب بھی خاموش تھا۔

''ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں کہ میں بنا بتائے چلا گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر کسی کی خبر نہ لی لیکن تم سب کو کیا ہوا ہے؟ میں پچھلے دو دنوں سے تم لوگوں کے رویّے سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے تم سب کا؟'' عمر نے سر اٹھا کے اُسے دیکھا۔ یکدم ہی احساس ہوا کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے؟ اُسکے نزدیک وہ لوگ آج بھی وہیں ہونے چاہیے تھے، جہاں وہ آخری بار چھوڑ کر گیا تھا۔ عمر نے گہری سانس لی۔

''تم ہمیں کتنے سال بعد ملے ہو؟'' سوال غیر متوقع تھا۔

''ہاں؟'' وہ سمجھ نہیں سکا۔

''مقدّم! جتنے سالوں میں نے تمہیں دیکھا ہے، اتنے ہی عرصے بعد دوسروں کو بھی۔ بلکہ در حقیقت، ہم سب ہی قریباً ایک دہائی بعد کل ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ یہ ملاقات بلکل غیر متوقع تھی۔'' اُس نے آہستہ سے کہا تو وہ سنّاٹوں میں گھرا رہ گیا۔ پھر بے چینی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اُسکے آفس کی سیٹنگ کچھ اس طرح تھی کہ اُسکی مرکزی میز کے ایک جانب اُسکی سربراہی کرسی تھی، جبکہ میز کی دوسری جانب ایک اور چھوٹی میز تھی، جسکے دونوں سروں پر ایک ایک کرسی رکھی تھی۔ اُس سے ملنے آنے والے آفیشلز اسی جگہ بیٹھتے تھے۔ درمیان میں رکھی چھوٹی میز چائے اور ریفریشمنٹ پیش کرنے کے کام آتی تھی۔ عمر اُنہی میں سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

''یعنی؟'' مقدّم اُسکے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''یعنی۔۔۔ تمہارے جانے کے بعد سب ختم ہو گیا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی اب میرا دوست نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور ایسے ہوئے کہ دہائی گزر گئی اور دوبارہ کبھی پلٹ کر نہ دیکھا'' مقدّم اُسکے سامنے والی کرسی پر بیٹھا۔ اُسکے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''کیوں؟'' وہ پریشان ہوا۔

''ایسا بھی کیا ہو گیا تھا عمر؟'' عمر نے اُسے دیکھا، وہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ جاننا اُسکا حق تھا۔ وہ اُسے مختصراً سب کچھ بتاتا چلا گیا۔ وہ سنتا رہا، شاک، دکھ اور بے یقینی سی چہرے پر چھاتی چلی گئی۔ تمام باتوں میں اس نے مقدّم کے لیے استعمال کیے جانے والے علی کے الفاظ حذف کر دیے تھے۔ دوستی بلا شبہ باقی نہیں تھی، لیکن پرانے تعلق کے ناطے ہی سہی، یہ اُسکا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اُسے علی سے بدگمان نہ ہونے دے۔

''اور میرے جانے کے بعد جو کچھ ہوا، وہ مجھے خضر سے پتہ چلا تھا'' اُس نے گفتگو سمیٹی۔

''خضر سے؟''

''ہاں! کیس بند ہونے کے کچھ عرصے بعد حسین کی اُس سے ملاقات ہوئی تھی،اُس نے ہی خضر کو بتایا جو کچھ میرے جانے کے بعد وہاں ہوا تھا۔''حسین کی خضر سے کیوں ملاقات ہوئی؟ یہ بات اُس نے نہیں بتائی۔ وہ سر تھامے بیٹھا رہا۔

''اتنا کچھ ہو گیا؟ایک ذرا سی بات ہی تو تھی۔اُس پر اتنا واویلا؟''

''ایک ذرا سی بات نہیں تھی آغا!''عمر نے کہا تو لمحے کو وہ تھما۔کتنے عرصے بعد اُس نے اُسکی زبان سے اپنا یہ نام سنا تھا۔

''جو آج ذرا سی بات لگ رہی ہے۔اُس وقت وہ ہمارے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔''

''یا شاید تم لوگوں کو معاملہ سنبھالنا نہیں آیا تھا''وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں! شاید یہ بھی ہے''اُس نے تھک کر پیچھے کی جانب ٹیک لگائی۔کوئی بھی وضاحت بیکار تھی۔

''ہم کم عمر،ناتجربہ کار تھے۔حالات سے لڑنا اور معاملہ سنبھالنا نہیں جانتے تھے۔اتنے سمجھدار بھی نہ تھے، غلطی ہم سب سے ہوئی تھی۔''اُس نے ہار مان لی۔دس سال پہلے وہ نوجوان لڑکے تھے۔آج اپنی اپنی زندگیوں میں کامیاب اور سمجھدار مرد۔۔۔

اور آج ایک دہائی بعد اس سمجھدار مرد نے ہار مان لی۔دس سالوں سے وہ الزام وقت اور حالات پر ڈال کر بری الزمہ ہو جاتا تھا، پر آج وہ ایسا نہیں کر سکا۔آج کے عمر نے، گزرے کل کے نوجوان اور ناسمجھ عمر کی غلطی تسلیم کر لی تھی۔مقدّم نے اُسے دیکھا۔وہ بہت تھکا ہوا اور خاموش سا تھا۔کوئی حزن سا اُسکی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا تھا۔

''جو ہوا، وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔''وہ اس سے زیادہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ دونوں کے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آ گیا تھا۔

''کیا تمہارا ملک چھوڑنے کا ارادہ ہمیشہ سے تھا؟''خاموشی میں مقدّم کی آواز گونجی۔عمر چند لمحے اُسے دیکھتا رہا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔وہ جھوٹ نہیں بول سکا۔وہ نہیں کہہ سکا کہ میرا ارادہ ہمیشہ سے تھا یا میں تو ہمیشہ سے کیریئر باہر بنانے کے خواب دیکھتا تھا۔اس ایک شخص کو وہ کبھی جھوٹ نہیں بول پایا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید سوال کرتا اور اُسکا بھرم ٹوٹ جاتا، وہ اچانک ہی کھڑا ہو گیا۔

''دیر ہو گئی ہے، مجھے چلنا چاہیے۔تمہیں اتنے عرصے بعد دیکھا تو سوچا مل لوں''وضاحت در وضاحت، ٹوٹے تعلق کو جوڑنے کی پر مشقت سی کوشش۔

مقدّم جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسکے ہر ہر انداز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا اور کہہ بھی نہیں پا رہا تھا۔ اُس سے مصافحہ کر کے وہ جانے کے لیے مڑا۔

’’عمر!‘‘ پیچھے سے پُکارا گیا۔ وہ رکا اور دوبارہ پلٹا۔

’’تمہارا جب دل چاہے، تم مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔ رابطہ بھی کر سکتے ہو۔‘‘ جانے اُس نے ایسا کیوں کہا؟ اُس نے سر ہلا دیا۔

’’خدا حافظ!‘‘

جب پرانے ٹوٹے تعلق دوبارہ جڑنے لگتے ہیں تو کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہتا، دیوار گر بھی جائے تب بھی درمیان میں ایک فاصلہ سا آ جاتا ہے، ایک خلا سا ہمیشہ کے لیے قائم رہ جاتا ہے۔ دیوار گرانا مشکل نہیں ہوتا، اس خلا کو بھرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے، فاصلہ طے کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ وہ بھی واپسی کی منزل کی پہلی سیڑھی پر آ چکے تھے۔

واپسی کی منزل کے پہلے دو مسافر۔۔۔

مقدّم اور عمر۔۔۔

دیوار گرا دی گئی تھی، لیکن فاصلہ اب بھی قائم تھا۔

--------+-------+-----

کل رات سے صبح تک اُسکی حالت کافی خراب تھی۔ صبح بھی وہ پناہ گاہ نہیں جا سکا تھا۔ عائشہ جی نے کال کر کے پوچھا تو اس نے شام کو آنے کا کہہ دیا۔ دوا کے اثر سے وہ ایسا سویا تھا کہ اُسے کہیں کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔ بچے ساری رات اُسکا انتظار کرتے رہے۔ اب اُسے ہر حال میں پناہ گاہ پہنچنا تھا۔ وہ کل والے سفید ٹراؤزر اور ڈیپر سویٹر میں ملبوس جب پناہ گاہ پہنچا تو شام کے چھ بج رہے تھے۔

اُسکی گاڑی گھر میں داخل ہوتی دیکھ کر جو بچہ جہاں کہیں بھی تھا، وہ سب چھوڑ چھاڑ کر وہیں آ گیا۔

’’بھائی آپ کہاں تھے؟ مجھے آپکو اپنے مارکس دکھانے تھے‘‘

’’بابا پتہ ہے؟ مرتضیٰ نے میری کلر پینسل گم کر دی‘‘

''میں نے سوری بھی بول دیا تھا''

کوئی اُسے بھائی کہہ رہا تھا تو کوئی بابا،ایک تین سالہ بچی اُسکے پاس آئی۔

''رجا۔۔۔رجا۔۔۔ میلی کلپ (رضا۔۔رضا۔میری کلپ)'' وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں اُسے پکارتی اپنی کلپز دکھا رہی تھی۔اُس نے اُسے گود میں اٹھالیا اور مسکراتے ہوئے اُن سب کی باتیں سننے لگا۔اُنکے پاس سنانے کے لیے پورے چوبیس گھنٹوں کی روداد تھیں۔اُسکا غصّہ، پریشانی اور تکالیف یکلخت غائب ہو گئیں۔وہ اُنکے حصار میں چلتا،اُنکی باتیں سنتا، مسکراتا ہوا لان میں رکھی کرسی پر آبیٹھا۔قریب ہی چندماہ کا بچہ واکر میں تھا۔اُسے دیکھ کر ھمک ہمک کر اُسکی جانب بڑھنے لگا۔اب کے اُس نے گود میں اٹھائی ہوئی بچی کو پاس کرسی پر بٹھایا اور اُسے گود میں لے لیا۔

''بابا! عبدالرافع کو بلی نے کل پنجہ مار دیا۔'' ایک آٹھ سالہ بچے نے کہا۔

''اوہ! کہاں ہے عبدالرافع ؟'' وہ پریشان ہوا۔

''میں یہ رہا۔۔''شرارتی سا چھ سالہ بچہ پیچھے سے نمودار ہوا۔اُسے دیکھ کر وہ ہنس دیا۔بازو وا کر کے اُسے اپنے قریب کیا اور ماتھا چوما۔

''کہاں زخم لگے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔بچے نے پاؤں آگے کر دیئے۔لمبا سا زخم آیا تھا۔

''کہا بھی ہے بلیوں سے دور رہا کرو،وہ ویکسینیٹڈ نہیں ہے'' پیار بھری ڈانٹ پر اُس نے منہ بسورا۔

''شیزا آپی نے ڈیٹول ٹیوب لگادی تھی''

''شاباش! میری سمجھدار بچی ہے شیزا''اُس نے قریب کھڑی تیرہ چودہ سالہ لڑکی کی تعریف کی تو خوشی سے اُسکی باچھیں کھل گئی۔اُسی لمحے پورچ کا دروازہ کھلا اور پانچ لڑکے اندر داخل ہوئے۔اُنکی عمریں سولہ سے اٹھارہ کے درمیان تھیں۔ہاتھوں میں کرکٹ کا سامان لیے وہ اندر داخل ہوئے تو رضا پر نظر پڑتے ہی اُسکے پاس آگئے۔

''شکر اللہ کا بھائی کہ آپ آگئے۔میری ایک میتھس پرابلم (ریاضی کا سوال) مجھے کل سے سمجھ نہیں آرہی تھی۔اب آپ آگئے ہیں ناں تو مجھے پڑھا دیجئے گا،ورنہ میں تو کل سے پریشان تھا کہ کس سے سمجھوں''اُسکے قریب آتے سب میں نسبتاً لمبے لڑکے نے کہا۔

''سوری بیٹا! مجھے ذرا کام تھا اسی لیے نہیں آیا۔ لیکن مجھے ذرا یہ بتاؤ۔۔۔''اُس نے گود والے بچے کو واپس واکر میں ڈالا اور قریب منتظر کھڑی ایک ڈیڑھ سالہ بچی اور اُسکے برابر گول گول آنکھوں سے اُسے دیکھتے تین سالہ بچے کو گود میں اٹھالیا۔

''یہ تم لوگ مغرب کی اذان کے پندرہ منٹ بعد کیوں آرہے ہو؟'' ہاتھوں میں پہنی گھڑی کی جانب اشارہ کرتے، بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

''بس آخری اوور رہ گیا تھا۔''ایک اور لڑکے نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا تو اس نے بس گھورنے پر اکتفا کیا۔

''جاؤ نماز پڑھو جا کر''اُس کے حکم پر پانچوں اندر بھاگے۔

''باقی بچے کہاں ہیں؟''اُس نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے شیزا سے پوچھا۔

''وہ اندر ہیں۔۔۔''

''چلو پھر اندر ہی چلتے ہیں'' وہ باقی دونوں کو گود سے اُتارتے آگے بڑھا ہی تھا کہ اندر سے ایک اور سال بھر کی بچی بھاگتی ہوئی آئی۔

''مومنہ گڑیا۔۔۔''رضا نے اُسے بھی گود میں اٹھاتے ہوئے پیار کیا۔ پیچھے سے آتے بچے کا واکر بھی وہ ساتھ ساتھ گھسیٹ کے لا رہا تھا۔ اندر تو بچوں کی ایک دنیا آباد تھی۔ کوئی ڈرائنگ کر رہا تھا، کوئی کھلونوں سے کھیل رہا تھا، پاس ہی دو تین بچوں کا گروپ پورے انہماک سے کارٹون دیکھ رہا تھا۔ ایک اور تیرہ چودہ سالہ لڑکی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی اپنا جرنل پھیلائے کام میں مصروف تھی۔ رضا کو اندر آتا دیکھ کر ایک بار پھر سے وہی ہوا جو لان میں ہوا تھا۔ بچے اُسکے آس پاس رنگوں کی طرح بکھر گئے تھے۔ سب کے پاس کوئی نہ کوئی کہانی تھی سنانے کو اور سب کے سب پہلے سنانے کیلیئے بے تاب۔۔۔

''میں سب کی بات سنوں گا لیکن پہلے سب جلدی جلدی اپنے کام مکمل کریں، پھر ہم ساتھ رات کا کھانا کھائیں گے۔''اُس نے اعلان کیا تو سب بچے خوشی سے بھاگتے ہوئے اپنا اپنا بقایا کام مکمل کرنے لگے۔ لڑکے بھی نماز پڑھ کے آچکے تھے۔ اب ساتھ بیٹھ کے اپنا اسائنمنٹ مکمل کر رہے تھے۔

''رضا!''اس آواز پر اُس نے مڑ کے دیکھا۔

''عائشہ جی۔۔۔اسلام علیکم''چہرے پر عقیدت مندانہ مسکراہٹ در آئی۔

''وعلیکم السلام ! تم نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا تھا'' وہ بولیں تو اس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری ؟''اُسے خاموش دیکھ کر وہ پریشان ہوئیں۔ Benzodiazepinesکا اثر اُسکے چہرے پر نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی چھائی ہوئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں''ایک ہاتھ سر کے پیچھے کیے، گردن کو دائیں سے بائیں اور پھر واپس بائیں سے دائیں جانب جھٹکا دیتے ہوئے اُس نے کہا۔ بچوں کے درمیان وہ جو کچھ دیر کے لیے سب بھول گیا تھا، اب کل کا سارا واقعہ نئے سرے سے دماغ میں تازہ ہو گیا۔ سر میں درد پھر اٹھنے لگا ہی تھا کہ نظریں سامنے بیٹھی سات سالہ بچی پر گئیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھی تھی۔

''ارمینے۔۔۔''اُس نے پیار سے اُسے پُکارا تو بچی نے نظریں اٹھا کے اُسے دیکھا۔ پہلے ناپسندیدگی و غصّہ، پھر ڈر و خوف اور پھر آنسو اُسکی آنکھوں میں واضع ہوئے۔

''یہاں آو میرے پاس۔۔۔''رضا نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اُسے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''ارمینے۔۔۔''رضا اور عائشہ جی دونوں نے ہی اُسے ساتھ پکارا۔ لیکن وہ اندر کمرے میں جا گھسی۔

''جب سے یہاں آئی ہے، ڈری سہمی رہتی ہے''عائشہ جی نے افسوس سے کہا۔

''وقت دیں اُسے، ٹھیک ہو جائیگی آہستہ آہستہ''اُس نے تسلی دی۔

''رضا بھائی ! دروازے پر کوئی خاتون آئی ہیں''تیرہ سالہ علیزے نے اندر آ کر اطلاع دی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں جا کر''عائشہ جی گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی۔ رضا ارمینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ توجہ بھٹک کر پھر سے ایف آئی اے کے آفس کی جانب جانے لگی تھی۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا پر سوچ رہا تھا۔

''بتاؤ مجھے، کون سا بچہ تھا ان میں سے ؟''عائشہ جی کی آواز کانوں میں پڑی تو اس نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کسی لڑکی کے ساتھ کھڑی تھیں۔ جبکہ وہ لڑکی تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس بچوں کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔ وہ رخ بدل کر واپس موبائل میں مصروف ہو گیا۔

''اتنے سارے بچے؟''اُسکی شکل دیکھ کر عائشہ جی کو ہنسی آئی۔

''جی! تم بتاؤ کس بچے نے تمہارے گھر کا شیشہ توڑا ہے؟''عائشہ جی کے سوال پر رضا کے کان کھڑے ہوئے۔

''وہ کوئی سات آٹھ سال کا بچہ تھا۔ بہت بد تمیز سا تھا۔''اُس لڑکی نے کہا تو وہ جھٹکے سے اُٹھا اور وہاں آیا۔

''ایک منٹ محترمہ! آپ نے میرے بچے کو بد تمیز کہا؟''کوئی اُسکے گھر کے بچے کیلئے ایسے الفاظ استعمال کرے، یہ اُسکے لیے نا قابل قبول تھا۔ محترمہ نے حیرت سے بے حد سیاہ آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ سانولی رنگت پر کاجل بھری وہ سیاہ آنکھیں سامنے کھڑا بندہ ختم کرنے کے لیے کافی تھیں۔

''یہ ہماری پڑوسن ہیں۔۔ جزا نام ہے انکا، کل صبح ہی یہاں شفٹ ہوئی ہیں اور۔۔۔''عائشہ جی کچھ بتا رہی تھیں لیکن رضا سن کہاں رہا تھا؟

''دیکھیے! میں کرائے دار ہوں، پہلے ہی شفٹنگ میں میرا بہت خرچہ ہوا ہے، اوپر سے آپکے بچے نے اتنا بڑا شیشہ فٹبال مار کر توڑ دیا۔ اور جب میں نے اُسے ڈانٹنا چاہا تو مجھے منہ چڑا کر بھاگ گیا۔''وہ ٹھیک ٹھاک تپی ہوئی تھی۔ سانولی رنگت غصّے کی وجہ سے سرخ پڑ رہی تھی۔

''نہیں نہیں بیٹا! میرے گھر کے بچے ایسے بد تمیز نہیں ہیں، آپکو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی''عائشہ جی وضاحت دے رہی تھیں۔ رضا خاموش۔۔

''میں نے اُسے اپنی آنکھوں سے آپکے گھر آتے دیکھا ہے۔ دیکھیں! شیشہ ٹوٹنا قابل قبول ہے لیکن یہ بد تمیزی میں برداشت نہیں کروں گی''اور بس، رضا جیسے ہوش اور حواس میں واپس آیا تھا۔ اُس لڑکی نے دوسری مرتبہ اُسکی بچے کو بد تمیز کہا تھا۔

''محترمہ! میرے بچے کیلئے دوبارہ ایسے الفاظ نہیں استعمال کیجئے گا''اُس نے وارن کرنے والے انداز میں کہا تو اس کا پارہ چڑھا۔

''تو اور کیا کہوں میں آپکے بچے کو؟ میں آپکو شکایت کر رہی ہوں اور آپ اُسی کی وکالت کر رہے ہیں؟''

''کونسا بچہ تھا مجھے بتائیں؟''اُس نے ضبط سے پوچھا۔

''بتایا تو ہے کہ کوئی سات آٹھ سال کے قریب عمر کا بچہ تھا''

''اس عمر کے بہت سارے بچے ہیں میرے، آپ حلیہ بتایئے''

''کیا مطلب؟ کتنے بچے ہیں آخر آپ کے؟''اُس نے طنز سے پوچھا۔

''اٹھائیس۔۔۔آپ کو کونسا مطلوب ہے؟ یا تو حلیہ بتائیں یا اپنا اور میرا وقت مزید برباد نہ کیجئے''اُس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔عائشہ جی پریشان کھڑی تھیں جبکہ جزا تو اُسکے بچوں کی تعداد سن کر ہی سکتے میں آگئی تھی۔

''کیا محلے کے بچوں کو بھی اپنا بچہ کہتے ہیں؟''مزید طنز،اس سے پہلے کے رضا کا ضبط جواب دیتا عائشہ جی نے کہا۔

''یہ سارے بچے اسی گھر کے ہیں اور ہمارے ہیں''اُسی لمحے وہاں عبدالرافع بھاگتا ہوا آیا۔

''بابا! یہ دیکھیں''وہ رضا کو کچھ دکھانا چاہتا تھا۔

''یہی تھا۔۔۔''اُسے دیکھ کر وہ چیخ پڑی۔

''عبدالرافع!''رضا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔وہ بیچارہ سٹپٹا گیا۔

''تم نے انکا شیشہ توڑا ہے؟''

''نہیں نہیں! اس نے نہیں توڑا''اُس سے پہلے ہی جزا نے جواب دیا۔اب تو صحیح معنوں میں رضا کا دماغ گھوم گیا۔

''محترمہ چاہتی کیا ہیں آپ؟ کبھی کچھ کہہ رہی ہیں کبھی کچھ''

''میرا مطلب یہ ہے کہ یہ اُس بچے کے ساتھ ہی تھا،جس نے شیشہ توڑا اور جب وہ مجھے منہ چڑا کر بھاگا تو اسی نے اسکو گھر کے اندر چھپایا تھا''اُس نے بتایا۔

''آپ نے ایسا کیا تھا؟''رضا نے پوچھا تو عبدالرفع نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کون تھا وہ بچہ؟''اُس نے خفگی سے پوچھا۔بھلا بتاؤ،اتنی دیر سے صاحبزادے کا مقدمہ لڑ رہا تھا اور وہی مجرم کا پشت پناہ نکلا۔

''وہ معید تھا''اُس نے پڑوس والے بچے کا نام لیا تو رضا کی سانس بحال ہوئی۔شکر گھر کا کوئی بچہ ملوث نہیں تھا۔

''اور اب وہ کہاں گیا؟''

''اپنے گھر۔۔'' اُس نے معصومیت سے کہا۔

''جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ میرے گھر کے بچے ایسے نہیں ہیں۔ معید پڑوسیوں کا بچہ ہے۔ آپ اُن کے پاس شکایت لیکر جا سکتی ہیں''اُس نے بات سمیٹی۔

''لیکن آپکے بچے نے بھی اسکو، چھپانے میں مدد کی تھی''وہ شرمندگی چھپاتے ہوئے بولی۔

''معافی مانگو عبدالرافع''، رضا نے اُسے مخاطب کیا۔ لہجے میں سختی کہیں نہ تھی، بس تنبیہہ تھی۔

''سوری آنٹی!''وہ گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

''اٹس اوکے''اُس نے کہا۔ اب بچے نے معافی مانگ لی تھی تو مزید کیا کہتی؟

''معذرت! آپکو زحمت ہوئی۔ شیشہ ٹوٹنے سے مسئلہ نہیں ہے مجھے، بس بچے کی یہ حرکت پسند نہیں آئی''رضا کو مکمل نظرانداز کرتے ہوئے اُس نے عائشہ جی سے معذرت کی۔

''میرے بچے کبھی بھی ایسا نہیں کرتے، اور بچے تو شرارتی ہوتے ہی ہیں۔ لیکن چلو کوئی بات نہیں! اچھا کیا بتادیا آئندہ احتیاط کرینگے''اپنی ازلی نرم لہجے میں جواب دیتی عائشہ جی نے اُسے مطمئن کیا۔ وہ اُن کو خداحافظ کہتی رضا کو مزید نظرانداز کرتی وہاں سے چلی گئی۔ اپنی خفت بھی تو چھپانی تھی۔

''سوری بابا!''عبدالرافع اُسکی ناراضگی سے پریشان ہوا۔

''کوئی بات نہیں آئندہ ایسا مت کرنا۔''اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے رضا نے پیار سے کہا پھر عائشہ جی کو دیکھا۔

''کون تھی یہ انارکلی؟''جزا کے لیے اس خطاب پر وہ ہنس دی۔

''بتایا تو تھا کہ ساتھ والے گھر میں شفٹ ہوئی ہے کل''

''کب بتایا؟''وہ حیران ہوا۔

''ارے! ابھی اُسکے سامنے ہی تو تعارف دیا تھا''وہ مزید حیران ہوئیں۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ رضا فوراً گی کہی ہوئی کوئی بات بھولا ہو۔

''اچھا!۔۔ میں نے سنا نہ ہو شاید'' کندھے اُچکاتا وہ اُنہیں حیران چھوڑتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''اٹھائیس بچے؟ بھلا اٹھائیس بچے کیسے ہو سکتے ہیں کسی کے؟'' گھر سے باہر آتی جزا، پڑوسیوں کے گھر شکایت کرنے کیلئے جانے کے بجائے، اپنے ہی گھر کی طرف چلی آئی۔ اتنے کم عمر سے مرد کے اتنے سارے اور ہر عمر کے بچے اُسے ہضم نہ ہو رہے تھے۔

''اُس پر سے عائشہ جی کہہ رہی تھیں کہ اُنکے بچے ہیں، پھر وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ اُسکے بچے ہیں۔ کیا ان دونوں کے ہیں یہ؟'' گھر آ کر بھی اُسکا دماغ وہیں تھا۔

''نہیں نہیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کم از کم بھی بیس تیس سال بڑی ہوں گی وہ اس سے'' خود ہی اپنے خیالات کی تردید کرتی وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کیے جا رہی تھی۔

''مجھے کیا؟ جسکے بھی بچے ہوں'' جب کچھ نہ سمجھ آیا تو کندھے اُچکاتے ہوئے اپنے کل کے انٹرویو کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

-------+-------+------

اگلی صبح رضا اپنے اسکول کے ہیڈ آفس میں تھا۔ آج اُسے وہاں کے اساتذہ کے ساتھ اہم مشاورت کرنی تھی۔

''چھٹی کے بعد مجھے سارے استاد میٹنگ روم میں چاہیے۔ زیادہ نہیں بس پندرہ منٹ کی مشاورت ہے۔ ایک اہم معاملے پر آپ سب کا مشورہ چاہیے'' اُس نے پرنسپل صاحبہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں گروپ پر میسج کر دیتی ہوں'' پرنسپل صاحبہ اثبات میں سر ہلاتی چلی گئیں۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے، بچوں کا وقفہ چل رہا تھا۔ وہ اپنے آفس کے دروازے کے پار گراؤنڈ میں دوڑتے بھاگتے، گرتے پڑتے اور ایک دوسرے پر ہنستے اُن معصوم بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ محبت سے، پیار سے، شفقت سے۔۔۔

اُسے نہیں معلوم کہ اللہ نے اُسکے دل میں بچوں کے لیے اتنی محبت کیوں رکھی تھی؟ وہ کئی کئی گھنٹے بھی بچوں کو شرارتیں کرتا دیکھتا گزار دیتا، تو بھی اُسکا دل نہ بھرتا۔ شور شرابے سے ہمیشہ دور، تنہائی پسند رضا پر بچوں کا شور کبھی بھی گراں نہ گزرتا تھا۔ پھر چاہے وہ کسی کے بھی بچے ہوں۔ زندگی کی فکروں سے آزاد وہ معصوم چہرے اُسکا دل موہ لیتے تھے۔

جب کبھی وہ کسی چینل میں بچوں کے مرنے، اُنکے جنگوں میں زخمی ہونے یا بھوک اور فاقے کرنے کی خبر سنتا تو اسکو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوتا۔ کتنے ہی دن اُس سے کھانا نہ کھایا جاتا۔ دل کرتا دنیا کے سارے پریشان، غم زدہ اور دکھوں کے مارے بچوں کو وہ پناہ گاہ لا کر بسا دے، اُن کا بچپن تباہ ہونے سے بچا لے، اس بے رحم دنیا سے اُنہیں چھپا لے۔ اس دنیا کی بے رحمیوں میں بچوں کا حصہ نہیں ہونا چاہیے۔ لوگوں کی نفرتوں کا مرکز بچے ہرگز نہیں ہونے چاہیے۔ وہ صرف پیار کے مستحق ہیں۔

کاش بچے نہ مرا کرتے۔۔۔

کاش جب جنگ چھڑتی

تو وہ آسمان کی طرف اٹھا لیے جاتے۔۔۔

بس کچھ وقت کے لیے، جب تک جنگ ختم نہ ہو جائے۔۔۔

پھر وہ اپنے گھروں کو سلامتی سے لوٹ آتے۔۔۔

اور جب انکے والدین ان سے پوچھتے تم کہاں چلے گئے تھے؟

تو وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔۔۔

"ہم تو بادلوں میں کھیل رہے تھے۔۔۔"

کاش بچے نہ مرا کرتے،

کاش وہ بڑے ہو کر۔۔۔ جوان بنتے،

کاش وہ ہنستے کھیلتے رہتے۔۔۔ ہمیشہ،

کاش ان کے نصیب میں امن کی صبح ہو،

ایسا آسمان ہو جہاں کوئی جنگی جہاز نہ اڑے،

اور ایسی زمین ہو جہاں قبریں نہ ہوں۔

(منتخب)

کبھی کی پڑھی ہوئی یہ نظم رضا کو بہت پسند تھی، نہ جانے کس نے لکھی تھی؟ مگر ایسا لگتا تھا کہ اُس کے دل کی بات لکھ دی ہو۔

''سر! اساتذہ مشاورت کے لیے جمع ہو رہے ہیں'' پرنسپل کی آواز پر وہ ہوش میں آیا۔ وقت دیکھا تو ایک پینتالیس ہو رہے تھے۔ گہری سانس لیتا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مشاورتی کمرے میں چلا آیا، جہاں مصروف سا شور سنائی دیتا تھا، تمام اساتذہ اُسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ وہ اپنی مخصوص نشست پر آ بیٹھا تو پرنسپل صاحبہ بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔

''السلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب؟'' اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے ایک نظر تمام اساتذہ کو دیکھا، اور اُسی لمحے نِگاہیں آخری کرسی پر بیٹھی لڑکی پر گئیں تو پلٹنا بھول گئیں۔

''میں آپکو بتانا بھول گئی، ہمارے ساتھ دو مزید ٹیچرز ہیں، اصغر صاحب جو کل اپوئنٹ ہوئے ہیں اور جزا صاحبہ جنہوں نے آج ہی ہمیں جوائن کیا ہے'' پرنسپل صاحبہ نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو جلدی سے تعارف کروایا۔ جزا کے چہرے پر تو حیرانگی ہی حیرانگی تھی، جبکہ ادھیڑ عمر اصغر صاحب اُسے اپنا مکمل تعارف دے رہے تھے۔

''میری طرف سے آپ دونوں کو خوش آمدید'' اُس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔ چوبیس گھنٹے میں یہ دوسری بار تھا کہ جب وہ اُس لڑکی کو دیکھ کر ساکت ہوا تھا۔ سر جھٹک کر سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''آپ سب کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہماری چالیس شاخیں ہیں اور تقریباً ہر اسکول میں تین سے پانچ سال تک کی عمر کے بچوں کے داخلے کیلیے درخواستیں آ رہی ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ہم پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کا اسکول میں داخلہ نہیں لیتے۔ لیکن اتنی زیادہ درخواستیں ہیں۔ آپ کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے اُن سب کو دیکھا۔

''آپ پانچ سال تک کہ بچوں کا داخلہ کیوں نہیں لیتے؟'' پہلا سوال جزا کی جانب سے آیا تھا۔

”کیونکہ ہمیں یہ لگتا ہے کہ پانچ سال تک کے بچے کی اصل جگہ اُسکی ماں کی آغوش ہے۔ جو کچھ بچہ وہاں سیکھ سکتا ہے، وہ اسکول میں نہیں سیکھ سکتا۔“ پرنسپل صاحبہ نے وضاحت دی۔

”جی! اسی لیے ہم ایسے والدین کو منع کر دیتے ہیں کہ اپنے بچوں کو گھر پر ہی رکھ کر اُنکی تربیت کیجئے۔ اسکول میں کتابوں کا بوجھ، ہوم ورک، ٹیسٹ اور ایگزام، ان سب بوجھ سے بچے کو ابھی آزاد رکھیں“ ایک اور سینئر ٹیچر نے مزید وضاحت دی۔

”تو کیا آپکو یقین ہے کہ وہ آپکی بات مان لیتے ہیں؟“ جزا کے اس سوال پر وہاں خاموشی چھائی۔

”یعنی؟“ رضا نے اُسے وضاحت دینے کا موقع دیا۔

”یعنی یہ کہ آپ جب داخلہ لینے سے انکار کرتے ہیں تو کیا وہ اپنے بچوں کو گھر بیٹھا لیتے ہونگے؟ اس شہر میں ہزاروں اسکول ہیں جو تین تو کیا ایک سال تک کے بچے کو بھی اپنے اسکول میں داخل کرنے کو تیار ہیں، وہ والدین یقیناً وہاں کا رخ کرتے ہونگے۔ بچے پر آپ نے کیا ہی احسان کیا؟“

”تو ہم اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟“ ایک خاتون استاد نے بیزاری سے کہا۔

”آپ اُن بچوں کو اپنے اسکول میں داخل کر سکتے ہیں“ جزا کے جواب پر تقریباً سب ہی نے اُسے ناگواری سے دیکھا تھا، سوائے رضا کے۔

”آپ تفصیل سے بتائیں کہ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ رضا نے پوچھا تو اُسے حوصلہ ملا، آج اُسکی شخصیت کا رعب جزا پر بھی چھانے لگا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپکے پاس آنے والے والدین میں سے ایک یا دو ہی آپکی بات پر عمل کرتے ہونگے، بقیہ اپنے بچے لیے کوئی نہ کوئی دوسرا اسکول تلاش کر لیتے ہونگے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم والدین کے سامنے دو صورتیں رکھیں ایک تو وہ، جو آپ سب والدین سے کہتے ہیں اور دوسری صورت میں ہم اُنہیں ایڈمشن دینگے لیکن اپنی شرائط پر، ان بچوں کے لئے پری اسکول کے نئے سیشن کا آغاز کرنا چاہیے۔ اُن کے اوقات صبح دس سے بارہ بجے تک ہوں، تاکہ اتنے چھوٹے بچوں کو مائیں صبح چھ بجے اٹھا کر وین میں ٹھونس کر، نیند میں جھولتے ہوئے سکول نہ بھیج دیں۔ یہ سیشن، بیگ فری ہونا چاہیے، یعنی ان بچوں کی کتابیں کم سے کم ہوں اور جو ہوں وہ بچوں کی متعلقہ استاد کے پاس سکول میں جمع رہیں گی، تاکہ اتنے چھوٹے بچے بیگ کے بوجھ سے آزاد رہیں۔ تیسری اور آخری بات، اس سیشن میں ٹیسٹ اور امتحانات نہیں

ہونگے، ہر بچے کو اُسکی ذہنی قابلیت کے حساب سے پڑھایا جائے گا۔'' مدلل لہجے میں اپنی بات پوری کرتی وہ رضا کو حیران کر گئی تھی۔ کل تک وہ اُسے بچوں سے بیزار مغرور لڑکی سمجھ رہا تھا، لیکن آج بچوں کے لیے فکر مند ہوتی وہ ایک نئے روپ میں سامنے تھی۔

''ایسا ہے کہ، مجھے یہ بات بے حد پسند آئی ہے۔ ہم اس پر کام شروع کرتے ہیں۔ تین ماہ بعد ہم ایسے بچوں کا اسی سیشن میں داخلہ لینگے۔ کورس اور کریکلم جزا صاحبہ بنائیں گی'' اب وہ سب کو ہدایت دے رہا تھا۔

''فیض صاحب! آپ ایچ آر کے ساتھ مل کر اس نئے سیشن کے لیے ٹیچرز کی بھرتیاں شروع کر دیں، اور پرنسپل صاحبہ یہ آرڈرز تمام شاخوں میں بھجوا دیں'' وہ سب کو ذمے داریاں سونپ رہا تھا۔

'' یہ بات واضح رہے کہ اس سیشن کا مطلب بچوں کا داخلہ لینا ہر گز نہیں ہے، بلکہ ہمارا پہلا مقصد والدین کو یہ احساس دلانا ہے کہ چھوٹے بچوں کو اسکولوں سے آزاد کر کے گھر کا ماحول دیں، اگر وہ راضی نظر نہ آئے تب اُنکے سامنے یہ آپشن رکھیں۔ آج کی میٹنگ ختم ہوئی'' نہایت پیشہ وارانہ لہجے میں گفتگو سمیٹ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پیچھے پرنسپل صاحبہ اور فیض، جزا سے اس نئے پروجیکٹ پر بات چیت کر رہے تھے۔ رضا اُس سے متاثر ہوا تھا۔ اُس نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اُسکے اپنے اسکول میں بچوں کا داخلہ نہ لینے سے کیا والدین واقعی بچوں کو گھر بٹھالیں گے؟ کیا وہ اُسکی بات سر جھکا کر تسلیم کر لیں گے؟ گھر کی طرف جاتے ہوئے اب اُسکے ذہن میں نئے سیشن کے لیے مختلف آئیڈیاز آرہے تھے۔

-------+---------+------

زندگی کا کام چلنا ہے اور وہ چلتی رہتی ہے۔ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد اُنہیں فرّخ صاحب نے دوبارہ ایف آئی اے کے آفس بلایا تھا۔ آخری بار رضا یہ سوچ کر گیا تھا کہ وہ اب ایسی کسی بریفنگ کا حصہ نہیں بنے گا۔ وہ اُن میں سے کسی کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

لیکن۔۔۔

وہ وہاں موجود تھا، آج پھر وہ سب ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ ماحول میں کوئی فرق نہ تھا۔ چہروں پر وہی اجنبیت اور لاتعلقی تھی۔ البتہ پچھلی بار ملنے والی حیرانگی کی جگہ اب مستقبل کی فکر نے لے لی تھی۔ نہ جانے فرّخ صاحب نے کیوں بلوایا تھا آج؟

شیر ازاُنہیں باری باری محکمہ مشاہدہ کے آفس میں بٹھا کر گیا تھا۔ پچھلی بار کے مقابلے میں آج نوید وہاں پہلے سے ہی موجود تھا، سامنے کوئی ڈائری نما فائل کھول رکھی تھی، اُنکے آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا یا پھر جان کر نظر انداز کرتا رہا، معلوم نہیں؟ فرّخ صاحب آ چکے تھے اور بریفنگ شروع ہو چکی تھی۔ رضا آج جس کے لیے آیا تھا وہ چہرہ اُسے کہیں نظر نہ آیا۔

''ایک اچھی خبر ہے، تم سب کو بتانا ضروری ہے۔ مائیکل عرف فرمان، جو کہ پس منظر سے غائب ہو گیا تھا، کل وہ ایک خلیل نامی شخص سے ملا ہے۔ خلیل کا سارا بائیو ڈیٹا ڈیپارٹمنٹ نے اکھٹا کر لیا ہے۔'' فرّخ صاحب کے پیچھے ایک کھچڑی بالوں والے شخص کی تصویر تھی۔ رضا کو اُس پر شناسائی کا گمان ہوا۔

''خلیل وہ واحد شخص ہے، جو ہمیں مائیکل تک پہنچا سکتا ہے، اس وقت خلیل۔۔۔'' وہ بہت کچھ بتا رہے تھے۔ نہ جانے کیا کیا؟ رضا کی نِگاہیں سکرین پر نظر آتے چہرے پر ٹکی رہ گئیں۔ دماغ بار بار سگنل دے رہا تھا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ لیکن یاداشت اس وقت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''سر! حسین مرتضیٰ کا یہاں ہونا ناگزیر ہو گیا ہے۔'' نہ جانے گفتگو کس رخ پر تھی کہ درمیان میں شیر از نے کہا تھا۔ رضا کا سارا وجود کان بن گیا تھا۔

''میری معلومات کے مطابق تو اُسے پچھلے ہفتے تک پاکستان آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے مجھے اب تک'' نوید کی بھاری سنجیدہ آواز کمرے میں گونجی تھی ''کیا کرنا چاہیے تب تک؟'' اُس نے سوال کیا تھا۔

''خلیل کے پکڑے جانے تک رک جاؤ، ابھی اُسے اطلاع دے کر پریشان یا خوفزدہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا معلوم تب تک وہ پاکستان آ جائے؟'' فرّخ صاحب نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پھر سے کچھ بتانے لگے۔ رضا کا دماغ پھر کہیں اور اٹک گیا تھا۔ اُس بار توجہ کا مرکز حسین تھا۔

حسین۔۔۔ جسکے لیے اس نے خود کو آج یہاں آنے پر راضی کیا تھا۔

حسین۔۔۔ جس سے وہ واقعتاً ملنا چاہتا تھا۔

حسین۔۔۔ جو اُسکا دوست نہیں بلکہ اُسکا محسن تھا۔

------+-------+------

گاڑی مرکزی شاہراہ پر رواں دواں تھی، گاڑی چلاتے اُسکا دماغ بار بار بھٹک کر ایف آئی اے آفس کی پارکنگ میں جارہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ لوگ بریفنگ میں موجود تھے، تب بار بار اُسکی نِگاہیں نوید کی جانب اُٹھتی تھیں۔ اُسکے سیاہ، سرمئی و سفید بال پیچھے کر کے سیٹ کیے ہوئی تھے، آنکھوں کے برابر وہ کٹ بہت گہرا لگتا، یقیناً ماضی میں بہت شدید چوٹ لگی ہوگی اُسے۔ پچھلی بار کے مقابلے آج اُسکا چہرہ بے تاثر سا تھا۔ بریفنگ ختم ہونے کے بعد وہ ایسے ہی اجنبیت برتتا وہاں سے اُٹھ کر جا چکا تھا۔ باقی چاروں میں سے باہر نکلنے میں پہل خود علی نے کی تھی، بنا کسی کی بھی جانب دیکھتے وہ جب پارکنگ میں آیا تو یاد آیا کہ گاڑی تو ابھی پہنچی ہی نہیں ہے۔ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ اُنکا سامنا کرنا اُسکے اعصاب پر بھاری پڑتا تھا۔ اُسکے پیچھے عمر اور مقدّم باہر آئے تھے۔ اُسے یکسر نظر انداز کرتے وہ دونوں دوسری جانب کھڑے آہستگی سے کوئی گفتگو کر رہے تھے۔ رضا باہر نہیں آیا، یا آیا بھی تھا تو علی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ اُسکے بعد جب تک وہ وہاں کھڑا رہا، وہ کہیں نظر نہ آیا جبکہ مقدّم اور عمر گاڑیاں آنے تک آپس میں محو گفتگو رہے تھے۔ اُسے نہیں یاد کہ پچھلے دو سالوں میں عمر نے کبھی بھی علی سے اتنی لمبی گفتگو کی ہوگی۔ حالانکہ اُس کا عمر سے روز کا ہی ملنا تھا۔ ایک ہی آفس میں ہوتے ہوئے، ایک ہی کمپنی کے شراکت دار ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے اور اُس کے درمیان دس سال پہلے آئی دیوار کو گرا نہ سکا تھا نہ ہی اس نے کبھی ایسی کوئی کوشش کی تھی۔ لیکن اتنے جلدی اُسکے اور مقدّم کے تعلقات کیسے بحال ہوئے تھے؟ دل میں کہیں آگ سی لگ رہی تھی۔ آج بھی یاد تھا کہ وہ دونوں کس طرح بیچ راستے میں اُسے چھوڑ کر فرار ہوئے تھے۔

دس سال پہلے کی وہ آخری ملاقات پوری جزئیات کے ساتھ اُسکی نظروں کے سامنے گھوم گئی تھی، اپنی ذات پر لگائے گئے رضا کے وہ فاش الزامات آج بھی اُسکا سکون تباہ کرنے پر پہلے دن کی طرح قادر تھے۔ لب بھینچے وہ اور تیز ڈرائیو کرنے لگا تھا۔

گھر پہنچ کر اُس نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی، اور گھر کے اندر داخل ہوا۔ لائٹ جلی ہوئی تھی۔ یقیناً سفیر صاحب جاگ رہے تھے۔ اُنکی آواز باہر لاؤنج تک سنائی دے رہی تھی۔

وہ کہاں بیٹھے تھے؟ کس سے بات کر رہے تھے؟ اُسے، ان سب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُنکا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی خیریت معلوم کرنے کی غرض سے فون کر دیتا تھا۔ سردی کی وجہ سے پہنے گئے لانگ کوٹ کے بٹن کھولتا، وہ سیڑھیاں چڑھنے ہی لگا تھا کہ کانوں میں پڑتی اگلی آواز نے اُسکے قدم زنجیر کر دیئے۔

وہ پتھر ہوا، کڑوڑوں ہوں یا اربوں۔۔۔اس ایک آواز کو وہ مجمعے میں بھی پہچان سکتا تھا۔آواز دوبارہ نہیں آئی تھی۔اُسے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی، تیز ہوتی دھڑکن کو گہری سانس لیکر نارمل کرتے وہ دوبارہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ وہی آواز دوبارہ سنائی۔

''نہیں۔۔۔یہ میرا وہم نہیں ہے''اُس نے خود کو کہا اور واپس اُترا اور ڈگمگاتے قدم اٹھا کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھنے لگا، جہاں سے یہ آوازی آرہی تھی۔آواز اب مسلسل سنائی دے رہی تھی۔اور اُسکے دماغ پر کسی ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھی۔ڈرائنگ روم کے دروازے کا پردہ برابر تھا۔اُس نے کانپتے ہاتھوں سے پردہ ہٹایا اور اندر کا منظر دیکھ کر اُسکے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

----------+---------+--------

''کیا مطلب امی، اُنکا بیٹا۔۔نہ اُسکی تعلیم ہے، نہ شخصیت اور تو اور وہ گٹکا کھاتا ہے۔آپ کیسے ایسے لوگوں کو میرے لیے گھر بلا سکتی ہیں؟''

جزا سخت طیش کے عالم میں چلا رہی تھی، لیکن اُسکی ماں کو مطلق پرواہ نہ تھی۔وہ ہمیشہ ایسے ہی شور شرابا کرتی لیکن اُسکی ماں کے پاس ہزاروں جواز ہوتے تھے اُسے چپ کروانے کو۔

''مرد کی شکل اور تعلیم کون دیکھتا ہے؟ اور گٹکا ہی کھاتا ہے نہ۔۔۔شراب تو نہیں پیتا۔تم جب اُسکی بیوی بنو تو چھڑوا دینا''اُسکی ماں نے اطمینان سے کہا۔

''میں اُسکی بیوی بنوں ہی کیوں؟''وہ چیخی۔

"بس بہت ہوا۔۔۔میں کونسا تمہاری شادی کروا رہی ہوں، صرف ملنے ہی تو کہا ہے۔اب گھر آنے والوں کو منع کردوں؟''

''بعد میں بھی منع ہی کرنا ہے تو ابھی کریں۔جب ہاں نہیں کرنی ہے تو میں کیوں تیار ہوکر اُنکے سامنے بیٹھوں؟''

''خاموش رہو، وہ مجھ سے بات کر چکے تھے فون پر، اب کیسے منع کردوں کہ نہ آئیں''

''نہیں! اصل بات یہ ہے، کہ آپکے ذہن میں کہیں نہ کہیں اقرار ہے جب ہی آپ منع نہیں کر رہی، آپ کیسے اپنی بیٹی کے لیے ایسی شخصیت کے حامل انسان کا ساتھ سوچ سکتی ہیں؟''وہ رو دینے کو تھی۔آگے سے اُسکی ماں کچھ کہہ رہی تھیں لیکن وہ آنکھوں میں آنسو لیے چپ بیٹھی تھی۔ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔۔۔ہمیشہ۔۔۔

اور کچھ ہی گھنٹوں بعد وہ تیار ہوئی کچھ آنٹیوں کے سامنے تھی، جو سر سے پاؤں تک اُسکا ایکسرے کر رہی تھیں۔ بات بات پر اپنے مہنگے گھر اور پیسوں کی زبانی نمائش بھی جاری تھی۔

''میری بیٹی الحمدللہ ! بہت سمجھدار اور پڑھی لکھی ہے''اُسکی ماں نے بات شروع کی۔

''بہن ! پڑھائی لکھائی کا کیا ہی کرنا، آپ نے فضول میں اتنا پڑھایا لڑکی کو۔ ہم تو کبھی نہ آتے کسی پڑھی لکھی لڑکی کا رشتہ لیکر، ویسے ہی اُنکے دماغ آسمانوں پر ہوتے ہیں''لڑکے کی ماں نے کہا۔

''تو پھر کیوں آئیں آپ؟''اب کہ اُسکی ماں کو بھی برا لگا۔

''بھئی ! سمجھا کریں آپکی بیٹی ذرا ادب سے رہے گی، ہمارے سامنے سر نہیں اٹھائے گی''اُنہوں نے بات گھمائی۔

''ابھی آپ نے کہا کہ پڑھی لکھی لڑکیاں نہیں چاہیے، کیونکہ اُنکے دماغ آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ اب آپ کہہ رہی ہیں کہ ادب سے رہے گی۔ آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟ میں سمجھ نہیں پائی''اُسکی ماں نے کہا۔

"ارے ! بیشک پڑھی لکھی ہے لیکن ہے تو کالی نہ، رنگ گورا ہوتا تو پھر تو میرے بیٹے کو غلام ہی بنا لیتی، بس اسی وجہ سے آئے ہیں۔ ہمیں بھابھی ایسی چاہیے جو بھائی کو مُٹھی میں نہ کرے''لڑکے کی بہن ظالمانہ حد تک صاف گو تھی۔ اُس نے شاک کی کیفیت میں اپنی ماں کو دیکھا جو بغلیں جھانک رہی تھیں۔

''رشتے والی بتا رہی تھی کہ رنگ کالا ہونے کی وجہ سے آپکی بیٹی کا رشتہ نہیں ہوا اب تک، عمر بھی پچیس چھبیس سال ہے۔ اب ہم تو اللہ کی خاطر آئے ہیں کہ کسی کا بھلا ہو جائے ورنہ ہمارے بیٹے کو کونسی کمی ہے؟ اب آپکی بیٹی کا رنگ کم ہے تو آپکو اُسکی شادی کروانے کے لئے کچھ دینا دلانا۔۔۔''لڑکے کی ماں ہمدردی کے لبادے میں چھپا کر وہی باتیں کر رہی تھی، جو باقی لوگ بھی یہاں سے کر کے جاتے تھے۔

وہ اٹھی اور اپنی ماں اور مہمانوں کی سامنے سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ روتے ہوئے۔۔۔ سسکتے ہوئے۔۔۔ پیچھے اُسکی ماں اب کیا کہہ رہی تھی اُسے پرواہ نہ تھی۔ دماغ میں بس ایک ہی لفظ تھا

''کالی''

--------+----------+--------

وہ گھر کے قریب بنے سوسائٹی کے پارک میں آگئی تھی، دماغ کڑھ رہا تھا اور دل جل رہا تھا۔ پارک میں اچھی خاصی رونق تھی۔ اُسے زہر لگتے تھے وہ لوگ جو اُسکے رنگ کو کوئی عیب یا بدنما داغ سمجھتے تھے۔ وکبھی بھی اپنے رنگ کے لیے احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانہ میں تو وہ کافی حد تک مغرور مشہور تھی، لڑکیاں اُسکے نین نقش کی تعریف کرتی تھیں، کتنی ہی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے پسندیدگی دیکھی تھی لیکن وہ کبھی بھی کسی کو حد سے باہر نہ جانے دیتی، وہ اچھے سے جانتی تھی کہ نہ صرف اُسکی شکل بلکہ اُسکی شخصیت بھی سحر انگیز اور پرکشش ہے۔ لیکن یہ سارا غرور تب دھرا کا دھرا رہ گیا، جب اُسکی ماں نے اُسکے لیے رشتے دیکھنے شروع کیے۔ پہلا اعتراض اسکے رنگ پر ہوتا، دوسرا اُسکے بالوں پر پھر لمبے قد پر، غرض ہر وہ شے جسے جزا اپنی خوبصورتی کا حصہ سمجھتی تھی، وہ ان لوگوں کو اُسکا عیب اور خامی لگتی۔ حد تو یہ تھی کہ ایک مرتبہ گھر آنے سے پہلے جب اُسکی ماں نے لڑکے والوں کو صاف لفظوں میں کہا کہ

''بہن! دیکھ لیجئے، میری بیٹی کا رنگ گورا ہرگز نہیں ہے، تو آپ پہلے ہی بتا دیں بعد میں آپکو اعتراض نہ ہو''

''نہیں نہیں! پھر آپ رہنے دیں'' یہ کہتے ہوئے خاتون نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور فون کاٹ دیا۔

جزا کبھی بھی ان سب باتوں سے پریشان نہیں ہوتی تھی، اُسے اصل مسئلہ اپنی ماں سے تھا، جو یہ سب سلسلہ روکنے کے بجائے، اُسے ہر دوسرے دن تماشہ لگانے کے لیے ایسے لوگوں کے سامنے بٹھا دیتیں۔ اُنکو لگتا تھا کہ بس شادی ہونی چاہیے، پھر چاہے جیسے بھی انسان سے ہو۔ پھر جب وہ انکار کر کے چلے جاتے تو اُسکی ماں کے پاس سیدھا سا جواب ہوتا کہ

''ہاں تو اب لڑکے والے ہیں، اُنکی مرضی انکار کریں یا اقرار۔ اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' وہ انکو دیکھ کر رہ جاتی، یعنی لڑکی والوں کی کوئی اوقات، کوئی حیثیت ہی نہیں؟ لڑکی کی ماں ہونا اتنا برا ہے کہ سر جھکائے اُنکی ہر غلط بات سنی جائے؟

سامنے بچے کھیل کود میں مشغول تھے، پاس بیٹھی مائیں، گھاس پر چادر بچھائے اُنکے لیے کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام کر رہی تھیں۔ اُسے اپنا باپ یاد آیا جو آج زندہ ہوتا تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔ بھائیوں کو تو اُس سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ ماہانہ خرچہ بھیج کر اپنا فرض پورا کر دیتے اور اُسکی ماں اتنے میں ہی اُنکا راگ الاپتی نہ تھکتیں۔

کافی دیر وہاں گزارنے کے بعد بلآخر وہ واپس گھر کی جانب چل پڑی، دروازے پر ہی اُسے اپنی ماں کھڑی نظر آئیں۔ جزا قریب آئی تو وہ دل پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔

''جز۔۔ جزا۔۔۔''اُنکا سانس پھول رہا تھا

''پارک تک گئی تھی میں بس''اُسے لگا کہ وہ شاید اُسکے گھر سے غائب ہونے پر پریشان ہیں۔

''جزا۔۔۔ مجھ سے سانس۔۔۔''وہ تیز تیز سانس لیتیں اُسکا ہاتھ پکڑے بولیں تو اُس کے دماغ نے ریڈ سگنل دیا۔

''امی! کیا ہو رہا ہے آپکو؟ امی؟''وہ تیزی سے اُنکا ہاتھ سہلانے لگی۔

''امی کچھ بولیں! خدا کے لیے۔۔''وہ اُنہیں ساتھ لگاتے ہوئے تقریباً چیخنے لگی تھی۔ اُسکا موبائل پاس نہیں تھا۔ حواس باختہ ہوتی جزا کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ اتنے میں اُسکے بلکل ہی برابر ایک گاڑی آکر رکی۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟''شیشہ نیچے کرتے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص پریشانی سے بولا تھا۔

''معلوم نہیں! مجھے نہیں پتہ کیا ہو رہا ہے؟''اُس نے تو جیسے ہاتھ پیر ہی چھوڑ دیے تھے۔ اُسکی حالت سمجھتا، رضا تیزی سے گاڑی سے اتر کر اُن تک آیا، اور پھر انہیں سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا۔

''ہمیں انہیں ایمرجنسی میں لیکر جانا ہوگا''اُس نے عجلت میں کہتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، جزا اپنی ماں کے ساتھ پیچھے بیٹھی اُنکا ہاتھ سہلا رہی تھی۔ تیزی سے گاڑی دوڑاتے وہ اُنہیں ہسپتال لے آیا۔ اُنہیں ایمرجنسی میں داخل کیا گیا تھا۔ بی پی شوٹ کرنے کی وجہ سے انکی یہ حالت ہوئی تھی، دواؤں سے لیکر ڈاکٹر سے بات کرنے تک سب کچھ رضا ہی دیکھ رہا تھا، وہ تو بس پریشان حال اپنی ماں سے لگی بیٹھی، دل ہی دل میں اُن لڑکے والوں کو کوس رہی تھی، جنکی وجہ سے یہ سب ہو رہا تھا۔

دو سے تین گھنٹے تک تو انکو مختلف نوعیت کی ڈرپ لگتی رہی، پھر کہیں جا کر اُنکی طبیعت سنبھلی تھی۔ ڈاکٹر نے ابھی ڈسچارج نہیں کیا تھا، کچھ دوائیں ابھی باقی تھی جو ڈرپ کے ذریعے دی جا رہی تھیں۔ اس دوران وہ صرف ایک ہی بار اندر آیا اور اُس سے حالات پوچھ کر باہر چلا گیا۔ باقی وقت وہ باہر ہی کوریڈور میں بیٹھا رہا تھا۔ جب وہ پرسکون ہو کر سو گئیں تو جزا کو کچھ حوصلہ ہوا۔ دماغ کا بوجھ کم ہوا تو پہلا خیال اُسی کا آیا۔

ہاتھ میں پہنی گھڑی دیکھی جو رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔ اُٹھ کر باہر آئی تو وہ دھیمے لہجے میں ڈاکٹر سے بات کرتا دکھائی دیا۔ وہ پریشان سی قریب چلی آئی۔

''کیا ہوا ہے؟ امی ٹھیک ہیں نہ میری؟'' اُسکے سوال پر رضا اور ڈاکٹر دونوں نے ہی چونک کر اُسے دیکھا۔

''آپکی امی بلکل ٹھیک ہیں، میں بس کچھ ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ آپ انکو بتا دیجیے گا مجھے اب راؤنڈ پر جانا ہے'' پہلے جزا اور پھر رضا کو مخاطب کر کے ڈاکٹر نے کہا پھر وہاں سے چلا گیا۔

''کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟'' اُس نے پریشانی سے اُس سے پوچھا، انداز ایسا تھا کہ بس ابھی رو دے گی۔

''شی از آلرائٹ۔۔۔ ریلیکس (وہ ٹھیک ہیں۔۔۔ پرسکون ہو جائیں)'' اُس نے تسلی دی۔ پرسوں وہ اُس سے جھگڑ کے گئی تھی، کل صبح وہ بردباری کے ساتھ، اپنی ذہانت سے اُسے متاثر کر رہی تھی اور آج عام لڑکیوں کہ طرح پریشان سی اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ چھپانے کی کوشش میں ناکام ہوتی، اُس کے سامنے تھی۔

''وہ اُنہیں کسی بھی قسم کی ٹینشن، تیل والی اور بھاری غذا سے دور رکھنے کو کہہ رہا تھا۔ اگر خدانخواستہ دوبارہ ایسا ہوا تو دماغ کی رگیں متاثر ہو سکتی ہیں''

''میں گھر سے باہر تھیں، پتہ نہیں وہ کب سے اس حالت میں تھیں؟'' وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

''ایسی حالت میں حواس باختہ نہیں ہوتے، اگر آپ پینک (خوفزدہ) کریں گی، تو مریض کی طبیعت اور بگڑے گی، آئندہ اگر ایسا ہو تو سب سے پہلے اپنے حواس بحال رکھ کر ایمبولینس کو کال کریں، پھر مریض کو ابتدائی طبّی امداد دیں۔'' وہ اُسے سمجھا رہا تھا۔

''مجھ سے نہیں ہوتا ناں!'' آنسوؤں سے بھری سیاہ آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھتے ہوئے بیچارگی سے کہا، اور رضا ڈوب گیا۔ پورے کا پورا۔۔۔۔

''میں کوشش بھی کروں، تب بھی ایسی حالت میں میرے اپنے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں، دماغ جیسے کام کرنا ہی چھوڑ دیتا ہے'' وہ مزید بیچارگی سے کہہ رہی تھی۔

''تمہارا بہت شکریہ! تم نہ آتے تو میری امی کو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے خاموش ہے تو فوراً ہی اُسکا شکریہ ادا کرنا مناسب سمجھا۔اُس نے گہرا سانس لیکر سر جھٹکا۔ایک تو یہ لڑکی۔۔۔

''شکریہ اُسکا کیا جاتا ہے جو احسان کرتا ہے،اور ماؤں پر احسان نہیں کیا جاتا''سنجیدگی سے کہتے اُس نے جزا کو حیران کیا تھا۔

''میری والدہ ہوتی تو میں اُنکے لیے بھی یہی کرتا،لیکن وہ میرے بچپن میں اِنتقال کر گئی تھیں۔'' پتہ نہیں اُس نے کیوں بتایا تھا؟شاید وہ اُسے تسلی دینا چاہتا تھا یا اُسکے سر پر کوئی احسان نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

''تو کیا عائشہ جی تمہاری والدہ نہیں ہیں؟''پچھلے دو دنوں میں وہ اُن دونوں کے آپسی رشتے کے متعلق یہی اندازہ لگا سکی تھی،اور اب وہ بھی غلط ثابت ہوا تھا۔

''نہیں! وہ میری بڑی بہن ہیں۔لیکن میری ماں جیسی ہی ہیں''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔لہجے میں عقیدت و احترام تھا۔

''اوہ!اور وہ بچے کس کے ہیں؟''

''بتایا تو تھا کہ میرے ہیں،کیوں؟ تمہیں یقین نہیں آیا اب تک؟''رضا نے شرارت سے پوچھا۔اپنے لہجے پر اُسے خود بھی حیرت ہوئی تھی۔

''آپکو گھر جانا چاہیے،بہت رات ہوگئی ہے۔باقی میں سنبھال لوں گی''گڑبڑاتے ہوئے بات بدلی،''تم''سے واپس''آپ''تک آئی۔بھلا وہ کیوں اس بارے میں پریشان تھی کہ بچے اُسکے ہیں یا کسی اور کے؟کیا سوچتا ہوگا وہ بھی؟دو دن نہیں ہوئے ملے ہوئے اور تفتیش کرنے بیٹھ گئی۔

''تمہاری والدہ کچھ دیر میں ڈسچارج ہو جائینگی،پھر ساتھ ہی چلیں گے''

''مگر۔۔''اُس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا۔

''چائے پیو گی؟''اُس نے رک کر یکدم ہی پوچھا۔

''ہاں؟''وہ حیران ہوئی۔

''ٹھیک ہے، ابھی لاتا ہوں'' اُسکے سوال کو اقرار سمجھتا، اُسکا جواب لینے کے لئے رکا نہیں تھا۔

وہ حیرت سے اُسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

--------+-------+------

''میں یہاں کبھی نہیں آتی، مجھے آپ سے کوئی مدد بھی نہیں چاہیے۔ میں بس۔۔۔''

سردی کی وجہ سے پہنے گئے لانگ کوٹ کے بٹن کھولتا وہ سیڑھیاں چڑھنے ہی لگا تھا کہ اُسکے کانوں میں پڑتی اس آواز نے اُسکے قدم زنجیر کیے تھے۔

وہ پتھر ہوا، کڑوڑوں ہوں یا اربوں۔۔۔ اس ایک آواز کو وہ مجمعے میں بھی پہچان سکتا تھا۔ آواز دوبارہ نہیں آئی تھی۔ اُسے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی، تیز ہوتی دھڑکن کو گہری سانس لیکر نارمل کرتا وہ دوبارہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ

''میں بس احمد سے ملنا چاہتی ہوں۔ ایک بار، صرف ایک جھلک دکھا دیں اُسکی۔ میں دوبارہ یہ مطالبہ نہیں کروں گی'' وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''نہیں۔۔۔ یہ میرا وہم نہیں ہے'' علی نے خود سے کہا اور واپس اُترتا، ڈگمگاتے قدم اٹھا کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھنے لگا، جہاں سے یہ آواز آ رہی تھی۔

''حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ میں اس قسم کے کسی بھی مطالبہ کے لائق نہیں ہوں۔ لیکن آپ احسان کر دیں مجھ گنہگار پر'' آواز اب مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اور اُسکے دماغ پر کسی ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے کا پردہ برابر تھا۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے پردہ ہٹایا اور اندر کا منظر دیکھ کر اُسکے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ اُسے دیکھ کر وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔

اور۔۔۔

پورے چار سال بعد،

فاطمہ آفندی، علی سفیر کے سامنے کھڑی تھی۔ کالا عبایا پہنے، چہرے کے گرد کاٹن کا کالا دوپٹہ لپیٹے، وہ اُسکے باپ کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔

''علی! یہ۔۔۔'' سفیر صاحب کو فوری طور پر سمجھ نہ آیا کہ کیا کہیں؟

''میں بس احمد سے ملنے آئی۔۔۔'' وہ خود ہی وضاحت دینے لگی۔

''نام بھی مت لینا میری اولاد کا'' تیز ہوتے تنفس کے ساتھ وہ دھاڑا تھا۔ فاطمہ تو فاطمہ، سفیر صاحب بھی ایک لمحے کے لیے گھبرا گئے۔

''ہمت کیسے ہوئی تمہاری یہاں آنے کی؟'' لہو لہو ہوتی آنکھوں سے اُسے دیکھتا، وہ اُس کی جانب بڑھا، وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''میری بات سنو علی!۔۔۔'' سفیر صاحب کوئی وضاحت دینے لگے۔

''میں بس اپنے بیٹے سے۔۔'' کانپتے لہجے کے ساتھ وہ سسکی تھی۔

''میرا بیٹا۔۔۔ میرا بیٹا ہے وہ'' اُسے بازو سے جھنجھوڑتے ہوئے علی نے اُسے باور کروایا تھا۔

''اور کس حق سے میرے بیٹے سے ملنے آئی ہو؟ بولو؟'' اُسے دوسری بار جھٹکا دیا۔ بس نہیں چل رہا تھا گلا ہی دبا دے اُسکا۔

''علی! چھوڑو اُسے۔۔۔'' سفیر صاحب اُسے پیچھے ہٹانا چاہتے تھے۔

''علی پلیز!۔۔۔'' وہ رو رہی تھی۔

''بھول گئی جاتے ہوئے کیا کہہ کر گئی تھی یہاں سے؟ ہاں؟ یا میں یاد کرواؤں؟'' اُسے ایک اور بار جھٹکا دیتے وہ حلق کے بل چلا رہا تھا۔

''بس کردو علی! بس کردو'' اُسے دھکا دیتے ہوئے سفیر صاحب نے فاطمہ کو اپنے پیچھے کیا تھا۔

''ابّا! آج آپ بیچ میں نہیں بولیں گے۔ آپ نے اسکو اندر آنے ہی کیسے دیا؟ یہ دو کوڑی کی عورت، میرے منہ پر مجھے ذلیل کر کے گئی تھی۔ نکلو! میرے گھر سے۔۔۔ چلو!'' وہ دوبارہ فاطمہ کی طرف بڑھنے لگا، اس سے پہلے کے وہ اُسکو دھکّے دے کر گھر سے نکالتا سفیر صاحب چیخ اٹھے۔

''میں نے بلایا تھا اسے یہاں، میرے کہنے پر آئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ احمد اپنی ماں سے ملے۔'' وہ ساکت ہوا۔

''میں چاہتا تھا کہ۔۔۔'' وہ مزید کچھ کہہ رہے تھے لیکن اپنا کانپتا ہاتھ اٹھا کر علی نے دروازے کی جانب اشارہ کیا اور پھولے ہوئے تنفس کے ساتھ بولا۔

''ابھی اور اسی وقت۔۔۔ یہاں سے دفع ہو۔ ورنہ میں۔۔۔ میں شوٹ کر دوں گا تمہیں'' اُسکی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے! میں جا رہی ہوں۔ جا رہی ہوں میں۔۔۔'' وہ پرس اٹھاتی تیزی سے باہر نکلی۔ علی کا اٹھا ہاتھ اُسکے پہلو میں گرا تھا۔ سرخ آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھا۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا؟''

''علی! ایک دفعہ آرام سے بیٹھ کر۔۔۔''

''میں نے پوچھا کیوں؟'' حلق کے بل چلاتے اُس نے میز پر رکھا گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا، سفیر صاحب ساکن رہ گئے۔ اتنے جلال میں تو وہ تب بھی نہیں آیا تھا، جب اُس نے فاطمہ کو طلاق دی تھی۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیا لگا تھا اُس دو ٹکے کی عورت کو؟ میرے بیٹے کو چھین لے گی مجھ سے؟'' سفیر صاحب ساکت ہوئے، وہ کیا سوچ رہا تھا؟

''نہیں بیٹا! تمہاری اولاد کو کوئی تم سے نہیں چھینے گا۔ تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟'' وہ نرم پڑے۔

''آپ مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔ بس'' وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔

''کیوں کہ وہ ماں ہے اُسکی، حق ہے اُسکا اپنی اولاد سے ملنے کا، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو تم ایک ماں سے اُسکا حق نہیں چھین سکتے۔ ایک بیٹے کے دل سے اُسکی ماں کی محبت نہیں نکال سکتے۔'' بلآخر وہ پھٹ پڑے تھے۔

''اور میرے حقوق؟'' اب کے وہ بولا تو آواز بھرا گئی تھی۔

''میرے حقوق ابّا؟ میرا حق نہیں تھا میری بیٹی پر؟ جسے اُس نے قتل کر دیا۔ کیا وہ میری اولاد نہیں تھی؟'' آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو وہ اندر دھکیلتے سوال کر رہا تھا۔ وہ چپ رہ گئے۔

''بہر حال۔۔۔''خود پر قابو پاتے اُس نے لہجہ دوبارہ سخت کیا۔

''وہ دوبارہ اس گھر میں نہیں آئے گی،نہ احمد سے ملے گی۔ میرے جیتے جی تو کم از کم ایسا نہیں ہو گا''اپنا فیصلہ سناتے ہوئے وہ گھر سے باہر نکل چکا تھا،یہ دیکھے بنا کہ دروازے کے پیچھے سے چھپ کر اُسے دیکھتے،اُسکے بیٹے کی آنکھوں میں کچھ تھا۔کچھ ایسا جو علی ایک بار دیکھ لیتا تو شاید فنا ہو جاتا۔

--------+---------+----------

ہسپتال میں اب کم لوگ نظر آرہے تھے،دونوں کوریڈور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔چائے کی پیالیاں دونوں کے ہی ہاتھوں میں تھیں۔ خاموشی دونوں کے درمیان ٹھہری ہوئی تھی،جزا کے دماغ میں بہت سارے سوالات تھے۔لیکن ہر بار جھجھک کر چپ ہو جاتی۔رضا اُسکی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔بلآخر اپنی پیالی کرسی کے کنارے پر رکھتے ہوئے بولا۔

''اسکول کا اؤنر(مالک) میں ہی ہوں،عائشہ جی میری پھوپھو زاد بہن ہیں اور بیوہ ہیں۔اور وہ سارے بچے جو پناہ گاہ میں ہیں،اُن سے میرا یا عائشہ جی کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔وہ یتیم،لاوارث بچے ہیں،یا وہ جنہیں اُنکے اپنے گھر والوں نے ہی بھوک،افلاس یا دنیاوی تقاضوں سے تنگ آکر بے گھر کر دیا ہے۔''اُس نے فرصت سے وضاحت دی تھی۔

''میں نے کب پوچھا؟''وہ گڑبڑا گئی۔

''میں نے بتا دیا،ورنہ ہو سکتا ہے کہ اگلے کئی دن تک تمہیں نیند نہ آتی''مسکراہٹ دباتے اُس نے چائے کی پیالی لبوں سے لگائی۔

''اب ایسا بھی کچھ نہیں ہے،آپ کسی کو بھی بتائیں گے کہ آپکے اٹھائیس بچے ہیں تو وہ حیران تو ہو گا''اُس نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔کچھ دیر خاموشی چھائی رہی،پھر جیسے کوئی خیال آیا تو کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ

''وہ بچے مجھے مختلف جگہوں سے ملے ہیں،اب سب کی تفصیل میں جانے کا اس وقت،وقت نہیں ہے''کمال مہارت سے مسکراہٹ چھپاتے سنجیدگی سے کہا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں پوچھا، بلکہ میں تو یہ کہہ رہی تھیں کہ کل اسکول نہیں آسکوں گی۔ امی بہتر ہو جائیں تو پرسوں سے دوبارہ جوائن کروں گی''اُس نے سٹپٹا کر سنجیدگی سے بتایا، جیسے وہ بس یہی سوال پوچھنا چاہتی تھی۔

''بلکل بلکل۔۔۔ تم یہی پوچھ رہی تھی۔''اُس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے! کل تم چھٹی کر سکتی ہو، لیکن پلیز پرسوں ضرور آجانا۔ پیر کا دن ہے نہ۔۔ کام زیادہ ہوتا ہے''اف!۔۔ جزا نے آنکھیں میچی، وہ اب کی بار مسکراہٹ چھپا نہ سکا۔

''اب کچھ نہیں بولوں گی میں''دل میں عہد کیا۔''لیکن میں بول ہی کہاں رہی ہوں؟''یہ تو خود ہی اندازے لگائے جا رہا ہے''سر اٹھا کر اُسے ایسے دیکھا جیسے کہیں وہ پھر اُسکے خیالات نہ سن رہا ہو۔ جبکہ وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا، سنجیدگی سے۔

''تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟ یعنی کوئی اور قریبی رشتے دار''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تو اُس نے گہری آہ بھری۔

''دو بڑے بھائی ہیں میرے''

''تو کہاں ہیں وہ؟ اُنہیں اطلاع دی؟''اُس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ضرورت نہیں ہے اُنکی''سختی سے کہتی وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ چہرے پر بہت ساری داستانیں رقم تھی۔ رضا نے مزید سوال نہیں کیا۔

''آپ آنٹی کو دیکھ لیں، اگر ڈرپ ختم ہو گئی ہو تو ہم اُنہیں گھر لے جاتے ہیں''ہاتھ میں بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتی کھڑی ہوئی۔

''جزا!۔۔۔''وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اُس نے اتنے عرصے میں پہلی بار اُسے نام سے پکارا تھا۔

''آنٹی کی طبیعت ٹھیک ہو جائے، تو کل تم پناہ گاہ آسکتی ہو بچوں سے ملنے؟''

''میں؟''اس غیر متوقع مطالبے پر وہ حیران ہوئی۔

''ہاں! بچوں کا کوئی رشتے دار نہیں ہے، اگر کوئی باہر سے اُن سے ملنے آجاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں''اِس بات پر اُس کے دل کو کچھ ہوا۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔

''میں کوشش کروں گی''اب اگر اُس نے احسان کیا ہی تھا تو چکانا اُس کا فرض بھی تو تھا، اسی لیے حامی بھرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

--------+-------+-----

گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کیے، بونٹ سے ٹیک لگائے، سینے پر بازو باندھے وہ سڑک کے اُس پار بنے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ دس سال پہلے وہ اس دروازے پر اکثر آیا کرتا تھا۔ گئے وقتوں میں گھر کا رنگ اور روپ کافی حد تک بدلا تھا، لیکن ظاہری طور پر وہ ویسا ہی تھا۔ کوئی یاد سی اُسکے دماغ میں چبھنے لگی۔ نہ جانے وہ کیوں یہاں آیا تھا؟ آیا تھا بھی تو یہاں آکر کھڑا کیوں ہو گیا تھا؟ آج کل دل کی حالت عجیب سی ہونے لگی تھی، زندگی پر چھایا جمود ٹوٹنے لگا ہو جیسے۔ وہ سر جھکائے جوتے کی نوک سڑک پر رگڑ رہا تھا کہ اچانک ہی اُس گھر کا دروازہ کھلا۔ اور سیاہ ٹراؤزر پر سیاہ ٹی شرٹ پہنے عمر باہر آیا، اُسے دیکھ کر مقدّم سیدھا ہوا۔ یہ تو اُسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس طرح اُس سے سامنا ہو جائیگا۔ ہاتھوں میں موبائل لیے وہ دروازے پر کھڑا کسی کو کال کر رہا تھا۔ مقدّم شش و پنج میں تھا کہ یہاں سے چلا جائے یا اس سے بات کرے؟ اُسے تو خود آنے کی وجہ معلوم نہ تھی، اُسے کیا بتاتا؟ فون کان سے لگائے عمر کی نظریں اُس پر پڑیں۔ آنکھوں میں پہلے ناسمجھی، پھر شناسائی اور پھر حیرت نے باری باری ڈیرہ جمایا، نہ جانے وہ کس کو فون کر رہا تھا؟ کال کاٹ کر اُسکے پاس چلا آیا۔

''مقدّم؟''اُسکے پاس آکر رکا اور حیرت سے اُسکا نام لیا۔

''تم یہاں؟''

''تم سے ملنے آیا تھا''اپنے یہاں ہونے کا کوئی جواز تلاش کرنے میں ناکام مقدّم نے تھک کر ہار مان لی۔

''مجھ سے؟''وہ مزید حیران ہوا۔''سب خیریت؟''

''پتہ نہیں؟''اُس نے کندھے اُچکا دیے۔

''تم ٹھیک ہو؟''عمر اُسکی باتوں سے پریشان ہوا۔

''ہاں ! میں تو ٹھیک ہوں، لیکن پچھلے ہفتے جب تم میرے آفس آئے تھے، تب تم مجھے ٹھیک نہیں لگے تھے، تو سوچا ملاقات کرلوں۔ آج ایف آئی اے آفس میں بھی تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں پوچھ نہیں سکا'' اُسکی فکر کرتا وہ، آج اُسے پہلے جیسا لگا تھا۔

''آؤ! اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' عمر نے اُسے گھر آنے کی دعوت دی۔

''اندر؟ نہیں خواہ مخواہ تمہاری فیملی ڈسٹرب ہو گی۔ ویسے ہی بہت رات ہو گئی ہے۔ میں تو بس ایسے ہی بلاارادہ چلا آیا تھا'' اُس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''میری فیملی؟'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسا، مقدّم سمجھ نہیں سکا۔

''اچھا چلو! کہیں باہر بیٹھتے ہیں۔ مجھے تم سے بات بھی کرنی تھی'' اُس نے اصرار کیا۔

''چلو ٹھیک ہے'' وہ مان گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک سٹریٹ ریسٹورانٹ میں بیٹھے تھے، چائے کی پیالیاں دونوں کے سامنے رکھی تھیں۔ اُسکے ساتھ آ تو گیا تھا، لیکن آج دونوں کے پاس ہی بات کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ وہ زمانے گزر چکے تھے، جب اُنکی گفتگو نا ختم ہونے والی ہوتی تھیں۔ یا شاید آج بات کرنے کے لیے تھا تو بہت کچھ، لیکن درمیان میں موجود خلا ابھی بھرا نہیں تھا۔ پریشانی سے ہونٹ کاٹتا وہ چائے کی پیالی کے کناروں پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ عمر اُسکی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ وہ یقیناً کسی بات پر پریشان تھا۔

''پوچھو! کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' خاموشی میں عمر کی آواز گونجی تو اس نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ پھر سیدھا ہوا۔

''پوچھنا کو کیا رہ گیا ہے؟ تم نے بتا تو دیا سب'' وہ اُداسی سے مسکرایا تھا۔

''مجھے لگا کہ جو کچھ یہاں ہوا تھا، وہ سب جاننا تمہارا بھی حق تھا۔ اسی لیے بتا دیا، کیا میں نے غلط کیا؟'' اُس نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! ٹھیک کیا تم نے، تم نہ بتاتے تو سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹ جاتا کہ تم سب کو آخر ہو کیا گیا ہے؟'' اُسکے جواب پر وہ چپ ہوا۔

''بہت بدل گئے ہو یار تم سب'' اُس نے تھک کر کہا۔ عمر کے چہرے پر اُداسی چھائی ''تم، علی، نوید کوئی بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ اور رضا۔۔'' اس نام پر عمر نے نظریں اٹھا کر دیکھا ''رضا کو دیکھ کے لگا بھی نہیں جیسے وہ کبھی کسی زمانے میں ہمیں جانتا ہو۔ اتنی اجنبیت؟ اتنی

بڑی تو بات بھی نہیں تھی عمر! بعد میں معاملہ حل کیا بھی جا سکتا تھا'' گفتگو کا رُخ پھر اُسی جانب چلا گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی ماضی سے نہیں نکل پا رہا تھا، کیونکہ اُسکے لیے یہ ایک ہفتے پہلے ہوا انکشاف تھا، جس سے نکلنا اُسکے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اور رہی بات عمر کی، تو کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ ایسا بھی ہو سکتا تھا یا ویسا بھی۔۔ یہ تمام مراحل وہ دس سال پہلے طے کر چکا تھا۔

''کیا ہم پہلے جیسے نہیں ہو سکتے؟'' عمر کا سوال غیر متوقع تھا، کتنے ہی لمحوں کے لیے مقدّم کچھ بول ہی نہ سکا۔

''ہمارے درمیان تو کچھ نہیں ہوا تھا نہ آغا! پھر ہم اپنے درمیان اتنا بڑا اخلا کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ جیسے تم اور میں بس کوئی پرانے شناسا ہی تھے۔ دوستی جیسا کوئی تعلق تو تھا ہی نہیں'' وہ خاموش رہا۔

''جب ہم دوبارہ پہلے جیسے نہیں ہو پا رہے تو باقی سب کے بدلنے پر کیا سوال کرنا؟'' یہ اُسکے سوال کا جواب تھا، یہی وہ بات تھی جو وہ اُسے سمجھانا چاہتا تھا۔

''دس سالوں میں ہم نے بہت لمبا سفر کر لیا ہے، بہت آگے آ چکے ہیں ہم، واپس پہلے جیسے مقام پر نہیں جا سکتے ہیں، البتہ۔۔۔'' وہ رکا، مقدّم سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''امکان ہے کہ چیزیں پہلے جیسی ہونے لگے، لیکن اس میں وقت لگے گا۔'' اُس نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا اُسے۔

''ہم ہو سکتے ہیں۔'' ان ساری باتوں کے جواب میں اُس نے یہی کہا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

''تمہارے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔'' پہلے تو وہ سمجھ نہ سکا لیکن جب سمجھ آیا تو ہنس دیا۔ ماحول پر چھایا سکوت یکدم ہی ٹوٹا تھا۔

''رات کے بارہ بج گئے، مجھے اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔'' مقدّم نے اچانک ہی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسکی عجلت دیکھ کر عمر مسکرایا۔

''شادی شدہ آدمی کو ویسے بھی گھر جلدی ہی جانا چاہیے۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تم سے کس نے کہامیں شادی شدہ ہوں؟'' وہ مسکرایا۔ دونوں اب ریسٹورونٹ سے باہر آچکے تھے۔ عمر کا گھر سامنے ہی کچھ قدموں کے فاصلے پر تھا۔

''نکاح شدہ تو دس سال پہلے ہی تھے، اب تک تو ایک دو بچوں کا والدین بھی ہونا چاہیے تمہیں اور لیلیٰ کو۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بول رہا تھا۔ مقدّم ہنستا رہا، پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا۔

''چلو پھر، خدا حافظ۔ آئندہ میں تمہیں ایسے ہی دیکھنا چاہتا ہوں'' گاڑی میں بیٹھتے اُس نے عمر سے کہا تھا۔

''آج ایسے ہی جا رہے ہو، اگلی بار گھر بھی آنا'' اُس نے بھی جواباً یاد دلایا کہ اس نے، اُسکی گھر آنے کی دعوت قبول نہیں کی تھی۔ وہ مسکرا کر گاڑی سٹارٹ کرنے لگا تو وہ دروازے سے پیچھے ہٹ کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہو گیا۔ گاڑی سٹارٹ کر کے، اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے، اس نے رخ موڑ کر عمر کو دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔

''لیلیٰ میری زندگی میں نہیں ہے،'' عمر کی مسکراہٹ سمٹی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا مقدّم اُسے ''خدا حافظ'' کہتے گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

یہ وہ کیا کہہ گیا تھا؟ لیلیٰ اُسکی زندگی میں نہیں تھی؟ مقدّم کی زندگی میں؟

وہ بے یقینی سے اُس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے اُسکی گاڑی کھڑی تھی۔

شکووں کے بعد کچھ رازوں کا افشا ہونا۔۔۔

واپسی کی منزل کی دوسری سیڑھی یہی تھی۔۔۔

اُس دوسری سیڑھی کے دو سروں پر کھڑے وہ دو مسافر۔۔۔

ابھی بھی ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔

وہ رات اُن دونوں پر ہی بہت بھاری گزرنے والی تھی۔

--------+-------+-----

ٹیکسی کے شیشے پر دھند چھائی ہوئی تھی، بارش کی بوندوں کے باعث شیشہ گدلا ہو رہا تھا۔ سردی بڑھ چکی تھی، پر اُسکے اندر کا موسم اُس سے بھی زیادہ سرد تھا۔ آنکھیں اُن بارش کی بوندوں سے زیادہ نم تھیں۔ آنسو اُسکے چہرے کے گرد لپٹا دوپٹہ بھگو رہے تھے۔ فاطمہ آفندی کے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اپنے ہی رچائے ہوئے کھیل میں بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔

''دو کوڑی کی عورت۔۔'' اپنے لیے علی کے الفاظ یاد آئے تھے۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے، ورنہ شوٹ کر دوں گا تمہیں۔۔'' یہ وہ شخص تھا، جس نے کبھی اُس سے اونچے لہجے میں بات بھی نہ کی تھی۔ اور آج اُسکی آنکھوں میں کتنی نفرت اور کتنی حقارت تھی فاطمہ کے لیے۔ بھیگتے چہرے کو صاف کرتے اُس نے شیشے سے سر ٹکا دیا۔ اب کوئی شے جگہ پر نہیں آنے والی تھی۔

لیکن ایسا سوچتے ہوئے وہ بھول گئی کہ۔۔۔

ایک سال پہلے جب اُس نے تقی کا گھر چھوڑا تھا، تو اُسے لگا تھا وہ اُسے ڈھونڈتے ہوئے واپس آئے گا، یا تو اُسے یا اُسکی بیٹی کو جان سے مار دیگا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ نہ وہ واپس آیا نہ اُس نے دوبارہ اُس سے ملنے کی کوشش کی۔ جب تانگے پر بیٹھ کر وہ اپنے باپ کے گھر آئی تھی، تب بھی اس نے یہی سوچ تھا کہ اُسکے گھر والے اُسے قبول نہیں کریں گے۔ کوئی شے پہلے جیسی نہیں ہو گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اُسکے باپ نے اُسکے منہ پر دروازہ ضرور بند کیا تھا، لیکن رات بھر بیٹی کو اپنی نواسی کے ساتھ دروازے پر بیٹھا دیکھ کر اُسے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ پچھلے ایک سال سے وہ وہیں تھیں۔ بے شک وہ اور اُسکی بیٹی، اُسکے بھائی اور بھابیوں کے سامنے تیسرے درجے کے شہری جیسی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن کم از کم اُسکی بیٹی محفوظ تھی۔

وہ ذات جس سے فاطمہ نے پناہ مانگی تھی، وہ ہر شے پر قادر ہے۔

وہ تواب ہے۔۔۔

وہ رحمان ہے۔۔۔

--------+-------+-----

سردی بڑھ گئی تھی، اور ہر ذی روح اپنے اپنے گھروں میں دبکی بیٹھی تھی۔ بارش نے ماحول اور زیادہ سرد کر دیا تھا۔ ایسے میں سیاہ جینس پر سیاہ شرٹ ٹک ان کیے، اس پر سیاہ کاٹن کا جیکٹ ڈالے، چہرے پر چھائی اپنی ازلی سختی کے ساتھ، نوید گاڑی چلاتے ہوئے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اُسکی بائیں جانب سمندر تھا۔ سامنے سٹریٹ لائٹ کی پیلی روشنیوں میں جگمگاتی سڑک سنسان پڑی تھی۔ آج کل ڈیوٹی سے آتے ہوئے اُسے پھر سے دیر ہونے لگی تھی۔ خلیل کی نشان دہی کرنا، مائیکل کو ڈھونڈھنے سے زیادہ آسان تھا۔ لیکن پھر بھی وہ لوگ اس بار کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بہت محتاط تھے، اُنکی ایک بھی غلطی اُسے خبر دار کر سکتی تھی۔ اور مائیکل کی طرح خلیل بھی ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔

پر سکون انداز میں ڈرائیو کرتے اُسکی نظریں اچانک ہی سامنے نظر آتے فوٹ پاتھ پر پڑیں۔ بائیں جانب جہاں سمندر تھا، اُس سے پہلے ریلنگ لگی تھی۔ ریلنگ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلوں سے رکھی سنگی بینچوں میں سے ایک پر وہ بیٹھا تھا۔

سرمئی کوٹ پینٹ پر، سیاہ رنگ کا لونگ کوٹ ڈالے، سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اُسکا چہرہ واضح تھا۔ نوید دور سے بھی اُسے پہچان سکتا تھا۔ اُسکا پیر آپ ہی آپ بریک پر گیا اور گاڑی سڑک کے کنارے رک گئی۔ وہ کچھ دیر اندر بیٹھا اُسے دیکھتا تھا پھر جانے کیا سوچ کے دروازہ کھول کر باہر آیا۔

کچھ ہی دور بینچ پر بیٹھا علی، اُسکی آمد سے بے خبر تھا، اپنے خیالوں میں محو، چہرہ پر ملال، حزن اور یاس کی تصویر بنے۔ نظریں سامنے نظر آتے سمندر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے خیالوں میں اس حد تک گم تھا کہ نوید بینچ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا لیکن اُسے تب بھی احساس نہ ہوا۔

نہ جانے اُسے کیا ہوا تھا؟ پچھلے دو ہفتوں سے خود کو اپنے خول میں بند رکھے نوید، آج اُسکی حالت دیکھ کر خود کو اس سے بات کرنے پر مجبور محسوس کر رہا تھا۔

”علی!“ آہستہ آواز میں پکارا۔ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی آواز میں، اُسکی آواز کہیں دب گئی تھی۔ اُسکے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

”علی!“ اب کہ ذرا زور سے پکارا تو وہ لمحے بھر کو چونکا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے ہی نوید کھڑا تھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ اُس کی خیریت دریافت کرتا آج وہ اُسے حیران کر رہا تھا۔

”میں؟“ عجیب سے انداز میں سوال کیا۔ نوید کو اُسکی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگی تھی۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟ اتنی رات گئے؟'' وہ آنکھوں میں ڈھیروں حیرت سموئے اُسے دیکھنے لگا۔ نوید جیسے اب ہوش میں آیا تھا، وہ کون ہوتا ہے اس سے ایسے سوال کرنے والا؟ کیا لگتا ہے علی اُسکا؟ وہ بھول گیا کہ دس سالوں کا فاصلہ ہے اُنکے درمیان؟

''میرا مطلب، تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔'' خود ہی سمجھ نہ آیا کہ کیا وضاحت دے؟ علی اُسے ہی دیکھتا رہا۔۔۔ یک ٹک۔۔

''میں گزر رہا تھا یہاں سے، تو تم پر نظر پڑی، سوچا کہ محتاط رہنے کو کہہ دوں۔'' وضاحت در وضاحت، علی اپنی سابقہ پوزیشن میں برقرار۔۔۔

ایکدم ہی اُسے احساس ہوا کہ صرف وہی بولے جا رہا ہے۔

''میں چلتا ہوں، خدا حافظ'' کہہ کر جانے کے لیے مڑا، کیا ضرورت تھی رک کر اُس سے بات کرنے کی؟ وہ تو اسے پہچاننے کا روادار بھی نہیں تھا۔ دل ہی دل میں خود کو کوسا۔

''تم مجھے پہچانتے ہو؟'' نوید کے قدم تھمے۔ رخ موڑ کے دیکھا تو علی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، قدم قدم اٹھاتا اُسی کی جانب آ رہا تھا۔

''پچھلی دو ملاقاتوں میں تو مجھے لگا تھا کہ شاید تمہاری یاداشت جا چکی ہے۔ تمہیں تو میں یاد بھی نہیں تھا'' اُس نے تو شکوہ کیا تھا، لیکن نوید کو طنز ہی لگا۔ چہرے پر سختی در آئی، دونوں ہاتھ جینز کی جیب میں ڈال کر لب بھینچے، اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔ دونوں کے درمیان قائم دیوار جو شاید چٹخنے لگی تھی، ایک مرتبہ پھر وہیں آ کھڑی ہوئی۔

''کیا مجھے تمہیں پہچاننا چاہیے تھا؟'' سوال تھا، لیکن اب کہ علی کو یہ جوابی طنز لگا تھا۔ جو وہ اُسکے ساتھ کر چکا تھا، کردار کشی، الزام تراشی اور اُسکی ذات پر اُچھالے گئے کیچڑ کے بعد، کیا واقعی اُسے علی کو پہچاننا چاہیے؟

''تو آج کیوں شناسائی ظاہر کی؟ آج بھی گزر جاتے اجنبیوں کی طرح، میری جان کی فکر نہ کرو'' نوید کے ماتھے پر بل پڑے، شکوے اور شکایتیں درمیان میں آنے لگی تھیں۔ وضاحتیں باقی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔۔۔'' مختصر جواب دے کر وہ جانے کے لیے مڑا۔

''نوید!'' پیچھے سے پُکارا تو وہ دوبارہ رکا، پلٹ کے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔۔۔ جاؤ تم'' سر جھٹک کے کہتا وہ واپس اپنی جگہ پر جا کے بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحوں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر مڑ کے اپنی گاڑی تک آیا۔ کتنی آسانی سے کہہ رہا تھا وہ کہ ''میری جان کی فکر نہ کرو'' اتنا آسان تھا کیا؟ جبکہ نوید اس کیس کو اُن سب سے زیادہ قریب سے دیکھ رہا تھا۔ کسی کو اگر معاملے کی سنگینی کا سب سے زیادہ احساس تھا تو وہ وہی تھا۔ ایسے میں اُسے کسی بھی خطرے کے آگے چھوڑ دینا اتنا آسان تھا کیا؟ گاڑی کے دروازے پر رکھا نوید کا ہاتھ ڈگمگایا۔

ایک لمحہ۔۔۔

بس ایک لمحہ تھا اُسکے پاس۔

وہ اپنے اور علی کے درمیان ڈولتی اس دیوار کو گرا سکتا تھا۔ پھر باقی رہ کیا جانا تھا؟ بس ایک خلا؟ ایک ذرا سا فاصلہ۔۔

فاصلے تو طے ہو جاتے ہیں۔ خلا بھی بھر جاتا ہے۔

سر اٹھا کر علی کو دیکھا، وہ واپس اپنی سابقہ حالت میں بیٹھ چکا تھا، چہرہ سخت اضطراب لیے ہوئے تھا۔ اتنی رات گئے وہ یہاں کیوں آیا تھا؟ آس پاس کوئی سواری بھی نہ تھی۔ کیا وہ پیدل یہاں تک آیا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی اُسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا اپنے ساتھ؟ ڈھیروں سوال تھے، اور جواب صرف سامنے بیٹھے اُس شخص کے پاس تھا۔ گہری سانس لیتے اُس نے ہینڈل چھوڑ دیا۔

وہ واپس پلٹا، بھلا اس شخص کو یہاں چھوڑ کے کیسے جا سکتا تھا؟ ماضی میں ایک بار چھوڑ دیا تھا، اب نہیں کر سکتا تھا۔

اُسکے پاس آیا، کتنے ہی لمحے کھڑا اُسے دیکھتا رہا، پھر برابر میں ہی کچھ فاصلہ رکھ کے بیٹھ گیا۔ علی نے حیرت سے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ سامنے نظر آتے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر خفگی صاف ظاہر تھی۔

آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ اُسے چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔

ایس ایس پی نوید عالم نے دیوار گرا دی تھی۔

واپسی کی منزل کی پہلی سیڑھی۔۔

پہلی سیڑھی پر کھڑے وہ دوسرے دو مسافر

نوید عالم اور علی سفیر۔۔۔

--------+-------+-----

"یہ کیا کر دیا تم نے؟ صاحب نے آخری بار کہا تھا کہ باجی گھر سے نہیں نکلنی چاہیے۔"

"میں کیا کروں؟ دوسرا گارڈ آج آیا نہیں اور میں بس تھوڑی دیر کے لیے باتھ رُوم گیا تھا۔"

"تو جا کر ڈھونڈ نہ۔۔۔ پتہ نہیں کب سے نکلی ہے گھر سے"

"میں دیکھ آیا ہوں ہر جگہ، اب کیا کروں۔ صاحب تو گولی مار دے گا مجھے"

"قبرستان دیکھا؟ میں نے سنا تھا وہیں جاتی ہے"

"دیکھ آیا وہاں بھی، اتنا بڑا قبرستان ہے۔ کہاں ڈھونڈوں؟ مجھے تو نہیں معلوم کہاں چلی گئی"

خوف سے کانپتے، ایس ایس پی نوید عالم کے وہ دونوں ملازم، اس وقت اپنی موت سامنے دیکھ رہے تھے۔ اُنکے صاحب کی بیوی گھر سے غائب تھی۔

(جاری ہے)

محل کی چھٹی قسط ماہِ اکتوبر کی پندرہ تاریخ کو میری ویب سائٹ اور فیس بک پیج پر پوسٹ کی جائے گی۔ انشاءاللہ